مدیر: ناصر احمد بی۔ اے، ایل ایل بی

جلد ۸۳ مارچ، اپریل ۱۹۹۹ء شمارہ ۔ ۳، ۴

اس شمارے میں

ناشر: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہور) یو ایس اے

پتہ: ۱۳۱۵ کنگز گیٹ روڈ، کولمبس، اوہائیو ۱۵۰۴-۴۳۲۲۱ (یو ایس اے)

سورہ فاتحہ کی مدح میں

منظوم کلام حضرت بانی سلسلہ احمدیہ

اے دوستو جو پڑھتے ہو ام الکتاب کو
اب دیکھو میری آنکھوں سے اس آفتاب کو

سوچو دعائے فاتحہ کو پڑھ کے بار بار
کرتی ہے یہ تمام حقیقت کو آشکار

دیکھو خدا نے تم کو بتائی دعا یہی
اس کے حبیب نے بھی پڑھائی دعا یہی

پڑھتے ہو پنج وقت اسی کو نماز میں
جاتے ہو اس کی رہ سے در بے نیاز میں

اس کی قسم کہ جس نے یہ سورت اتاری ہے
اس پاک دل پہ جس کی وہ صورت پیاری ہے

ترجمہ: ممتاز احمد باجوہ ایم۔ اے ‘ ایم ایڈ

نیا نظام عالم - ۵

حضرت مولانا محمد علی کی معروف کتاب "نیو ورلڈ آرڈر" کا ترجمہ

باب دوم - معاشی مسئلہ

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ زکوٰۃ صرف لازمی خیرات ہی نہیں بلکہ یہ ایک ریاستی ادارہ ہے اور جہاں ریاست مسلمان ہو وہاں ایک قومی ادارہ ہے۔ فرد کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ کو جمع کرے اور جس طرح چاہے تقسیم کرے۔ اسے ریاست یا قومی تنظیم کو جمع کرنا چاہئے۔ پھر قوم پر اس کو خرچ کرنا چاہئے۔ زکوٰۃ دینے والے کو اپنی بچت کا کچھ حصہ بطور خیرات مستحق افراد کو دینے کا حق نہیں ہے۔ بلکہ اس کو اس فنڈ میں جمع کرانا چاہئے جو قومی بہبود کے لئے استعمال ہو۔

صنعت اور جائیداد کی ریاستی ملکیت کو بعض اوقات زکوٰۃ یا اسلامی عشری نظام کا متبادل سمجھا جاتا ہے اور پھر سطحی طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کے معاشی مسئلہ کا بہترین حل ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح ہر ملک کی دولت صحیح معنوں میں بڑھتی ہے۔ لوگ جتنی زیادہ محنت سے کام لیں گے اور جتنی زیادہ ذہانت کا استعمال کریں گے اتنا ہی وہ زیادہ قدرتی ذرائع پر قابو پا سکیں گے اور یہی دوسرے لفظوں میں دولت کا پیدا کرنا ہے۔ صنعت کی ریاستی ملکیت اور نجی کاروبار کے نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ محنت اور ذہانت میں مقابلہ اور فرض شناسی کا عنصر مفقود ہوتا ہے اور آخرکار سستی اور غیر دلچسپی کے رواج سے پیدائش کا معیار گر جاتا ہے اور قوم کو غریب کر دیتا ہے لیکن اس کے بالمقابل ایک الگ‘ طاقتور اور آزاد قوم کی حیثیت سے رہنے کا جذبہ بعض اوقات کام کرنے کا محرک بن سکتا ہے لیکن یہ بھی قومی سطح پر مقابلے کی موجودگی کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے۔ جنگی حالات میں یہ جذبہ اور بڑھ جاتا ہے جبکہ کسی دوسری طاقتور قوم سے تباہی کا خطرہ ہو جس طرح روس میں ہے۔ لیکن امن کے دنوں میں نجی تجارت اور انفرادی ملکیت کی عدم موجودگی میں سستی اور غیر دلچسپی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اور سوویت حکومت بھی اس امر پر مجبور ہو گئی ہے کہ اپنے پہلے خیالات و نظریات میں تبدیلی لائے اور کسی حد تک مقابلہ کے عنصر کو نظام میں رائج کیا جائے۔

تاہم جائیداد کی ریاستی ملکیت جو صنعت کی ریاستی ملکیت کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہے اس کے نتائج ان حالات سے بھی بدتر ہوں گے جو کہ سرمایہ داری نے پیدا کئے ہیں۔ سرمایہ داری کی برائیاں سرمایہ داروں کی تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے شدید ہو گئی ہیں۔ مقابلہ میں حصہ لینے والے جتنے کم ہوں گے سرمایہ داری اتنی ہی زیادہ برائیاں اپنے ساتھ لائے گی اور جب میدان میں صرف ایک سرمایہ دار ہو گا خواہ وہ ریاست ہو یا فرد واحد اتنی ہی زیادہ سرمایہ داری کی برائیاں نمایاں طور پر ظاہر ہوں گی۔ بلکہ ایک فرد واحد قوم کا تنہا سرمایہ دار زیادہ قابل برداشت ہو گا بمقابلہ ریاست کے جو ملک کی تمام جائیداد اور صنعت کی مالک ہو۔ فرد واحد پر نکتہ چینی کی جا سکتی ہے اور اس کا اپنے آپ کو درست کرنا اس کے اپنے مفاد میں ہو گا۔ لیکن ریاست کا معاملہ ایسا نہیں۔ ریاست تمام قسم کی تنقید کو سختی سے دبا سکتی ہے جس کو وہ اپنے مفاد کے خلاف سمجھتی ہے۔ اس دنیا میں ہر قسم کے ظلم و تشدد کا علاج ہے لیکن ریاست کے ظلم و تشدد کا علاج نہیں۔ خاص کر وہ حکومت اور ریاست جو ملک میں واحد و تنہا سرمایہ دار ہو۔ یہ کہنا کہ سرمایہ دار حکومت عوام کی بہتری کے لئے کام کرے گی اسی طرح بے بنیاد ہے جس طرح یہ بات کہ ایک ڈکٹیٹر صرف ان لوگوں کی بہتری کے لئے کام کرتا ہے جو اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ ریاست دراصل ایک ضروری برائی ہوتی ہے جو معاشرہ کے خطرناک لوگوں کو دبانے کے لئے ہوتی ہے۔ اس کی زیادتی کبھی کبھار خوفناک ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی خوفناک اور خطرناک لوگوں کو دبانے کے لئے ہوتی ہے لیکن یہ بہت ہی خوفناک اور خطرناک ہو جاتی ہے جب اس کے ہاتھوں میں مالی معاملات آ جائیں جن سے دوسرے ادارے محروم ہوتے ہیں۔ حکومت کو صنعت اور جائیداد کی ملکیت میں اجارہ داری دے دینا اس کے ہاتھوں میں ظلم و زیادتی کا سب سے خطرناک ہتھیار دینے کے

مترادف ہے اور اس کی تباہیاں عالمی جنگوں کی تباہیوں سے زیادہ ہولناک ہوں گی جو آج ان سب کو درپیش ہیں۔

اسلام کا معاشی نظام صنعت اور جائیداد کی ذاتی ملکیت میں دخل اندازی نہیں کرتا اور انسان کو اس کی محنت کے پھل سے محروم نہیں کرتا اور مقابلے کے میدان کو زیادہ محنت کرنے والوں اور زیادہ ذہانت استعمال کرنے والوں کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ اور سرمایہ داروں اور دولتمندوں کو اپنی دولت میں سے معاشرہ کے اپنے سے محروم لوگوں کے مفاد کے لئے رضاکارانہ طور پر دینے کی تلقین کرتا ہے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سرمایہ داروں کی تعداد بڑھاتا ہے تاکہ مقابلے کا میدان جہاں تک ہو سکے وسیع ہو جائے اور مقابلہ صحت مند ہو۔ درحقیقت زکوٰۃ قوم کے غریب افراد کو اس قابل بنانے کے لئے ہے تاکہ وہ تھوڑے سرمائے سے اپنا کام شروع کر سکیں اور اپنی سخت محنت اور کوشش سے اس میں اضافہ کریں۔

زکوٰۃ کے علاوہ اسلامی قانون وراثت کی رو سے دولت کو زیادہ ہاتھوں میں تقسیم ہو جانا چاہئے۔ چھوٹے سرمایہ داروں کی تعداد اسی طرح بڑھ جائے گی۔ اپنی جمع شدہ دولت کے چالیسواں حصہ کی بطور زکوٰۃ ہر سال ادائیگی کے بعد آدمی کچھ دولت اپنی موت کے بعد چھوڑتا ہے جیساکہ ہر محنتی اور سخت کوش کارکن کو کرنا چاہئے۔ اسلامی معاشی قانون کے مطابق یہ دولت ایک آدمی کی ملکیت نہیں بن جاتی جیساکہ عام رائج قانون کے مطابق سب سے بڑا بیٹا یا بہن کا حق ملکیت تسلیم کیا جاتا ہے۔

اسلام موجودہ قانون وراثت میں دو طرح کی اصلاح رائج کرتا ہے۔ یہ خواتین کو بھی مردوں کے ساتھ حصہ دار بناتا ہے۔ اور ورثاء کے جمہوری حقوق کے مطابق جائیداد کی تقسیم کا حکم دیتا ہے۔ اس طرح سے ایک سرمایہ دار کے مرنے پر بہت سے چھوٹے سرمایہ دار اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ قرآن کریم اس بارے میں عام قانون کو اس طرح بیان کرتا ہے "مردوں کے لئے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی چھوڑیں اور عورتوں کے لئے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی چھوڑیں۔ خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت۔ ایک مقرر حصہ۔ (۴:۷)

ظہور اسلام سے قبل عربوں میں بہت مضبوط اور ظاہری طور پر بھی بڑا مستحکم رواج تھا کہ صرف وہی وارث بن سکتا ہے جو تلوار چلا سکتا تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو وراثت میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا جو اپنے دشمنوں سے میدان جنگ میں لڑنے اور مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھے۔ یہ رواج ان لوگوں کے لئے خاص کشش رکھتا تھا جن میں دن رات قبائلی جنگیں جاری رہتی تھیں۔ یہودی قانون میں عورت کو مرنے والے کی جائیداد کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ ان کا وراثت میں کسی حصہ کا ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اور جب تھوڑے مسلمان تمام عرب کے خلاف دفاعی جنگوں میں مصروف تھے وراثت کا رائج الوقت قانون غیر منصفانہ قرار دے کر منسوخ کر دیا گیا اور ایک نیا قانون نافذ کیا گیا جو قبیلے اور ملک کی حفاظت میں لڑنے والوں کے ساتھ بیٹیوں اور یتیموں کو برابر کا شریک قرار دیتا ہے۔ مسلمانوں کا خدا تعالیٰ پر اتنا پختہ ایمان تھا کہ بلا کسی پس و پیش کے انہوں نے اس قانون کو تسلیم کر لیا۔

اس نئے قانون کی رو سے وارثوں کو دو گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پہلا گروپ بچوں، والدین، خاوند اور بیوی پر مشتمل ہے۔ دوسرا گروپ بھائیوں اور بہنوں کا ہے۔ پہلے گروپ کے تمام افراد فوری طور پر حصہ دار ہیں۔ اگر وہ تمام زندہ ہوں تو تمام کو جائیداد میں حق ملے گا۔ دوسرے گروپ کے افراد اس وقت وارث بنیں گے جب پہلے گروپ کے سب یا کچھ افراد موجود نہ ہوں۔ دونوں گروپوں میں مزید وسعت ہو سکتی ہے۔ مثلاً پوتے پوتیاں یا اس سے بھی بعد کے زیادہ نچلے وارث بچوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ دادا دادی اعلیٰ وارث والدین کی جگہ لیتے ہیں۔ چچے چچیاں اور دور کے رشتہ دار بھائیوں اور بہنوں کی جگہ لیتے ہیں۔

اسلامی قانون کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے جو دولت کی منصفانہ تقسیم میں توازن اور باقاعدگی پیدا کرتا ہے۔ یہ قرض لینے والے اور قرض دینے والے کے تعلقات کے متعلق ہے۔ قرض لینے والے سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ پوری دیانتداری اور مستعدی سے انہیں قرض ادا کرے۔ جیساکہ رسول اکرم صلعم کی حدیث میں ہے "تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنا قرضہ اچھی طرح ادا کرے"۔ اور اسی طرح قرض خواہ کو چاہئے کہ وہ قرض کی وصولی میں نرمی اختیار کرے اور اپنے مال سے بڑھ کر اپنے ساتھی کی پرواہ کرے۔ معاشرہ کے متعلق اسلام کا بنیادی نقطہ نگاہ انسانی ہے کہ مصیبت زدہ کی ضرور مدد کرنی چاہئے۔ قرآن کریم میں یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر مقروض تنگدست ہے تو

ادائیگی قرض کو حالات کے بہتر ہونے تک ملتوی کر دیا جائے اور پھر یہ کہ اگر اس کو بطور صدقہ کے معاف کر سکو تو تمہارے لئے بہتر ہے اگر ایسا کرنے کی قدر و منزلت کا تم کو علم ہو۔ اس اصول پر نبی کریمؐ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب آپ مسلم ریاست کے سربراہ تھے فرمایا۔ "میں ایمان والوں کے ان سے بھی زیادہ قریب تر ہوں۔ سو جو مومن فوت ہو جائے اور قرض چھوڑے اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے اور جو کوئی جائیداد چھوڑے وہ وارثوں کا حق ہے۔ (بخاری ۶۹:۵)۔ قرض جو کسی صحیح ضرورت کے لئے لیا گیا ہو اور قرض دار اس کو ادا کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کو ریاست ادا کرنے کی ذمہ دار ہو گی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کا معاشرتی نظام سود کی اجازت نہیں دیتا۔ سود کی ممانعت کا تعلق قرآن کریم کے مطابق خیرات سے ہے۔ خیرات کا انسانی ہمدردی سے گہرا تعلق ہے۔ سود تمام ہمدردانہ جذبات کو ختم کر دیتا ہے۔ سود خور اس شخص کی طرح ہے جس کو شیطان نے چھو کر باؤلا کر کے گرا دیا ہو تا آنکہ وہ اٹھنے کے قابل نہ رہا ہو۔ درحقیقت سود خور (قرض خواہ) کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ مقروض کو آخری حد تک پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا اگر اس طرح وہ اپنے لاکھوں کے سرمایہ میں ایک پائی کا اضافہ کر سکتا ہو۔ اس کی خود غرضی بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ تمام ہمدردی کے جذبات سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے دل پر لالچ کی حکمرانی ہو جاتی ہے اس لئے اسلام بنیادی طور پر اس کے خلاف ہے۔

علاوہ ازیں سود بے کاری کی عادت کو بھی نشوونما دیتا ہے۔ کیونکہ سود خور خود کوئی سخت کام یا دستی محنت کرنے کی بجائے دوسروں کی محنت پر مفت خور بن جاتا ہے۔ سرمایہ اور مزدور کے درمیان جو کشمکش جاری ہے اس میں اسلام مزدور کا ساتھ دیتا ہے۔ سود کی ممانعت کر کے اس نے دونوں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تا سرمایہ مزدور کو غلام نہ بنا سکے۔ اسلام نے محنت کو جو عزت کا مقام دیا اس سلسلہ میں قرآن شریف کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ نے تجارت کی اجازت دی ہے اور سود منع کیا ہے۔ کیونکہ تجارت کرنے میں محنت اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور اخلاق نشوونما پاتے اور بلند ہوتے ہیں۔ سود اس کے بالمقابل بے کاری، مکاری اور ظلم کی عادت کو پروان چڑھاتا ہے۔ مظلوم کی مدد کرنا جب وہ مشکل حالات میں ہو اسلام کے معاشرتی ڈھانچہ کا مقصد ہے لیکن سود خوری کا مقصد مقروض کو مزید مشکل میں ڈالنا ہے۔ اسی لئے سود خوری کو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کہا گیا ہے۔ (۲۷۹:۲)

یہ ممانعت صرف سود تک ہی محدود نہیں کی گئی۔ تمام قسم کا نفع خواہ اس کی شرح زیادہ ہو یا کم، یا اس کا نفع مقررہ مدت کے بعد اصل میں شامل ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ ہر قسم کے منافع میں آخرکار سود کی شکل اختیار کرنے کے جراثیم ہوتے ہیں اور مقروض کے لئے ظلم کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ تمام ممالک میں قرض داروں کی تاریخ کے مطالعہ سے یہی نتیجہ نکلا ہے۔ بعض اوقات یہ دلیل دی جاتی ہے کہ سود کی ممانعت سے تجارت اور کاروبار سرانجام دینے اور اہم قومی سکیموں کی تکمیل میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر اس میں نقصان کا خدشہ ہے تو اس طرح عالمی جنگوں کو ناممکن بنا کر اس کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ یہ نسل انسانی کے لئے ناقابل بیان مصیبت اور تکلیف کا باعث ہوتے ہیں جو صرف سود پر لئے گئے قرض کے بل بوتے پر لڑی جاتی ہیں۔ اوائل کے زمانہ میں عظیم مسلمان قوموں نے وسیع پیمانے پر تجارت کی اور اہم قومی سکیم کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ وہ تہذیب کے سفر میں دنیا کے عظیم اقوام کے راہنما تھے۔ یہ صحیح ہے کہ جدید دنیا کے حالات مغرب کی مادی تہذیب نے پیدا کئے ہیں جس میں اسلامی معاشی نظام کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ لیکن جو اعلیٰ اقدار اسلام اپنے پیش نظر رکھتا ہے وہ ناقابل عمل نہیں ہیں۔ اور صدیوں تک ابتدائی اسلامی تہذیب میں اس پر عمل ہوتا رہا۔

سودی سرمایہ جس سے کاروبار چلایا جاتا ہے عام قرضوں سے تھوڑا مختلف ہے۔ دراصل اس میں سرمایہ اور محنت ایک قسم کے حصہ دار ہیں۔ ایسی شراکت کو منع نہیں کیا گیا۔ لیکن اسلام کا معاشرتی نظام چاہتا ہے کہ سرمایہ اور محنت کو نفع و نقصان میں بھی حصہ دار ہونا چاہئے۔ سود کی مقررہ شرح پر ادائیگی کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ ہمیشہ نفع حاصل کرے خواہ کاروبار میں نقصان ہی ہو رہا ہو۔ بعض وقت یہ دلیل دی جاتی ہے کہ محنت اور سرمایہ کو حصہ دار بنانا قابل عمل نہیں کیونکہ اس کا حساب یا کھاتہ رکھنا پڑتا ہے لیکن تجارت کے لئے حساب کتاب کا رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں حساب کتاب ٹیکس کی ادائیگی کے لئے بھی ضروری ہے تمام جائنٹ سٹاک کمپنیاں جو وسیع پیمانے پر تجارت کر رہی ہیں حساب کتاب اور کھاتے رکھتی ہیں۔ یہ

طریقہ کار سرمایہ پر منافع کمانے کی نسبت قوم کی عام فلاح و بہبود کے لئے زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے جو کہ صرف سرمایہ داری کی برائیوں میں اضافہ کرتا اور محنت کے لئے ناانصافی کا موجب ہوتا ہے۔ بڑے بڑے منصوبوں جیسے ریلوں اور نہروں کی تعمیر کے لئے حکومت یا کوئی کمپنی قرض لے تو ان پر اسی اصول کو کارفرما ہونا چاہئے اور اسی طرح عام طور پر بینکوں کو امداد باہمی کی بنیا پر استوار کیا جا سکتا ہے۔ جیساکہ اسلام کے معاشرتی نظام کا تقاضہ ہے اور اس طرح انسانیت کے لئے رحمت کا باعث بن سکتا ہے۔

قرآن کریم کے مطابق ہر آدمی جو اپنے پیچھے دولت چھوڑے اس کو کچھ رقم یا حصے کی وصیت کرنی چاہئے جو ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔ نبی اکرمؐ کے ایک ارشاد کے مطابق یہ خیراتی مقاصد کے لئے ہو ان میں غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کی مدد کو مقدم رکھا ہے۔ یہ وصیت قرآن کریم کے مطابق فرض ہے۔

"جب تم میں سے کسی پر موت موجود ہو عمدگی کے ساتھ وصیت کرنا فرض ٹھہرایا گیا ہے اگر وہ بہت سا مال ماں باپ کے لئے اور قریبیوں کے لئے چھوڑے یہ متقیوں پر لازم ہے۔"

ارشاد نبویؐ کے مطابق وصیت خیراتی کاموں کے لئے ہوتی ہے اور اس کو ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے تاکہ وارث محروم نہ رہ جائیں۔ وصیت زکوٰۃ کی طرح غریبوں کی ترقی و بہبود کے لئے نفع بخش ذریعہ ہو سکتی ہے۔ اگر ریاست اس کو فرض قرار دے دے تو یہ قرآن پاک کے الفاظ اور روح کے بالکل مطابق ہو گا۔

==============

ضمیمہ باب دوئم

خلاصہ اسلامی تعلیمات کا معاشی پہلو

اسلام کے معاشی نظام میں محنت مزدوری کو نہایت اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا ہے "ہاتھ سے کما کر روٹی کھانے والے سے بہتر خوراک کوئی نہیں کھاتا" (بخاری ۳۴:۱۵)۔ آپؐ نے مزید ارشاد فرمایا "پیغمبر خدا حضرت داوٗدؑ اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کھانا کھاتے تھے"۔ یہاں تک کہ بکریاں چرانے کی ملازمت کو بھی باعزت سمجھا جاتا تھا۔ نبی اکرمؐ نے خود بھی ابتدائی دنوں میں چند قراط کے بدلے بکریاں چرانے کا کام کیا ہے۔ (بخاری ۷:۲) آپؐ کے صحابہ وزن اٹھاتے۔ ان کو یہ نصیحت کی جاتی تھی کہ اگر ضروری ہو تو اپنی روزی کمانے کے لئے جلانے کی لکڑیاں اپنی پیٹھ پر لاد کر بازار میں بیچیں (بخاری ۲۴:۵۰) غرضیکہ حقیر ترین کام بھی معزز سمجھا جاتا تھا۔ وہ لوگ جو قصاب، سنار، لوہار، جولاہے یا بڑھئی کا کام کرتے تھے معاشرے کے باعزت رکن سمجھے جاتے تھے۔ (بخاری ۳۲-۲۸، ۲۱) نبی پاکؐ خود بھی اپنے کپڑے دھوتے اور جوتے مرمت کرلیا کرتے تھے۔ خود اپنی بکریوں کا دودھ دوہ لیتے اور اپنے ہاتھوں سے برتن صاف کرلیتے اور اگرچہ وہ دنیا کے معلم کی حیثیت سے بڑے معزز تھے اور پھر ساتھ ہی بادشاہ بھی تھے تاہم اپنے گھریلو کاموں میں بیویوں کا ہاتھ بٹاتے تھے (بخاری ۱۰:۴۴) عورتیں بھی مردوں کی طرح محنت مزدوری کے کام کرتیں تھیں۔

کسی مزدور کی مزدوری روک رکھنے کو سخت الفاظ میں ناپسند کیا جاتا تھا۔ "قیامت کے دن میں اس شخص کے خلاف جھگڑوں گا جو کسی کو ملازم رکھتا ہے اس سے پورا پورا کام لیتا ہے لیکن اس کی مزدوری ادا نہیں کرتا (بخاری ۳۴:۱۰۰)۔ اس کے برعکس مزدور کی مزدوری کو کسی نفع بخش کاروبار میں لگانا ایک بڑی نیکی ہے کہ اس کی رقم میں کافی اضافہ ہو (بخاری ۳۷:۱۲)۔ قرآن کریم نے یہ بنیادی اصول مقرر کیا ہے کہ ملازم اپنا کام پوری وفاداری اور قابلیت سے سرانجام دے اور مالک کو اس کی خدمات کا عوضانہ پورا پورا ادا کرنا چاہئے (۲۸:۲۰-۲۵) باقی تمام معاملات میں ملازم سے بالکل برابری کا سلوک کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مالک کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھا سکتا ہے۔ ملازم اور مالک حقیقت میں دو کاروباری شریک کی حیثیت رکھتے ہیں اور مالک اور مزدور کے رشتہ کے حوالے سے ایک کو اعلیٰ اور دوسرے کو ادنیٰ نہ سمجھا جائے (بخاری ۳۷:۲۴)۔

دولت کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر مغربی تہذیب کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے کیونکہ وہ دولت کو ہی زندگی کی کا ماحصل سمجھتے ہیں۔ معاشی مفاد کا حصول اسلام کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتا ہے اس کے بالمقابل خدا کے عائد کرہ فرائض باقی تمام فرائض پر مقدم ہیں۔ حدیث میں آتا ہے "کہ لوگ خرید و فروخت کرتے اور تجارت کرتے تھے لیکن جب خدا تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض کے ادا کرنے کی باری آتی تو مال تجارت اور نہ خرید و فروخت اللہ کی عبادت کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے (بخاری ۳۴:۸)۔ قرآن کریم بھی مسلمانوں کی

سرگرمیوں کو انہی الفاظ میں بیان کرتا ہے (۲۴:۷-۳)۔ اسلام دولت کو اس کا صحیح مقام یعنی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ قرار دیتا ہے۔ "خدا تعالیٰ نے تمہاری دولت کو تمہارے قیام کا سبب بنایا ہے۔ اس لئے اس کو کم عقل لوگوں کے حوالے کر کے ضائع نہ کیا جائے" (۴:۵)۔ اس کو بے جا نہ خرچ کیا جائے۔ لیکن دولت ضروری نہیں کہ عزت کا باعث بھی ہو۔ اور نہ ہی تنگ دستی بے عزتی کی بات ہے (۸۹:۲۶'۲۵) دولت کا جمع کرنا ایک طرف اطمینان و سکون قلب کو گنوا دیتا ہے اور دوسری طرف انجام کار تکلیف دہ ہوتا ہے (۴:۲۰۴-۲)

اس لئے ہر ایک مرد اور عورت کا حق ہے کہ وہ اپنی محنت سے دولت کمائے۔ دولت محنت کا ثمرہ خیال کی جاتی ہے۔

"مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں (۴:۳۲) اور حقیقت یہ ہے کہ کسی کو دولت کی ملکیت سے انکار کرنا محنت کے ثمرہ سے انکار کرنا ہو گا۔ مرد اور عورت دونوں دولت کے ورثہ میں حقدار ہیں (۴:۷)۔ اسے بطور تحفہ یا ہبہ کے بھی دیا جا سکتا ہے (۴:۴ بخاری ۵۱:۱) کسی پر دولت کی ملکیت کی کوئی حد نہیں (۴:۲۰)۔ کوئی شخص جو پچاس روپے یا اس سے زیادہ کا مالک ہو اس پر زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے یعنی سالانہ ڈھائی فیصد۔ جو کہ مرکزی خزانہ میں جمع کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ غریبوں کی مدد کی جائے۔ (۹:۶۰ بخاری ۲۴:۱'۴' مشکوٰۃ ۹:۱) اس فنڈ کا مسلمان حکومت یا مسلمانوں کی کوئی جماعت انتظام اور انصرام کرے۔ زکوٰۃ لفظ کے حقیقی معنوں میں خیرات نہیں یہ ایک ٹیکس ہے جو حکومت کو ادا کیا جاتا ہے یا کسی تنظیم کو۔ اگر ضرورت پڑے تو صرف ایک تہائی فرد کے پاس رہنے دیا جاتا ہے جو وہ اپنی خواہش کے مطابق تقسیم کرتا ہے (مشکوٰۃ ۶:۱)

اسلام میں خیرات کا بڑا وسیع مفہوم ہے جس میں اپنے کسی ساتھی سے نیکی کرنا یا اس کی کسی معاملہ میں مدد کرنا یا اس کو کسی برائی سے باز رکھنا یا اس کی کسی معاملہ میں رہنمائی کرنا یا کسی سے خوش اخلاقی سے ملنا وغیرہ شامل ہیں (بخاری ۲۴:۳۱' ۵۶:۷۳)۔ بے زبان جانوروں سے اچھا سلوک کرنا بھی خیرات ہے۔ خیرات' خود بخود دینی چاہئے نہ کہ کسی کے مانگنے پر دی جائے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھیک مانگنے سے زیادہ معزز ہے (بخاری ۲۴:۶۰)۔ خیرات لوگوں کی بھلائی کے لئے اعلانیہ طور پر بھی دی جا سکتی ہے یا خاموشی سے بھی دی جا سکتی ہے (۲:۲۷۴)

معاشی ذرائع میں تجارت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ایماندار تاجر کو خدا کے نیک بندوں میں گنا جاتا ہے۔ جو خدا کے بندوں کی خدمت کے لئے اپنی زندگی صرف کرتے ہیں (ترمذی ۱۲:۴)۔ فروخت کنندہ کا فرض ہے کہ وہ ایماندار ہو اور ناپ تول میں کمی نہ کرے (۱۷:۳۵) اور لین دین میں فراخدل ہو (بخاری ۳۴:۱۶)۔ اگر فروخت شدہ چیز میں کوئی نقص ہو تو اس نقص کو خریدنے والے پر ظاہر کر دینا چاہئے (بخاری ۳۴:۱۹) خریدنے والے کو موقع فراہم کرنا چاہئے کہ وہ خریدتے وقت چیز کو اچھی طرح دیکھ بھال کر لے (بخاری ۳۴:۶۲)۔ غلہ کے فروخت کے متعلق خاص ہدایات ہیں کیونکہ یہ ہر شخص کی ضرورت ہے۔ ان کو مارکیٹ میں صحیح طریقہ پر فروخت کرنا چاہئے تاکہ یہ لوگوں کو اس قیمت پر مہیا کی جائے جس پر پیدا کرنے والے نے فروخت کیا تھا (بخاری ۳۴:۴۹)۔ غلہ یا اجناس میں سٹہ بازی کی ممانعت ہے (بخاری ۳۴:۵۴)۔ غلہ کی ذخیرہ اندوزی تاکہ اس کے ذریعہ مصنوعی طور پر قیمت میں اضافہ کیا جائے سخت منع ہے (مشکوٰۃ ۱۲:۸)۔ زمین یا غیر منقولہ جائیداد کے متعلق ہدایت ہے کہ اس وقت بیچی جائے جب فروخت کرنے والا اس رقم کو کسی اور غیر منقولہ جائیداد خریدنے میں لگائے (احمد بن حنبل ۴:۳۰۷)

زمین کی کاشت اور پھلدار درختوں کا لگانا ایک بڑی خدمت اور نیکی کا کام سمجھا جاتا ہے (بخاری ۴۱:۱) لیکن ساتھ ہی تنبیہہ بھی کی گئی ہے کہ جو لوگ دیگر ترقی کے طریق اپنانے کی بجائے صرف کاشتکاری کو "کلیتاً" اپنائیں وہ ترقی نہیں کر سکتے (بخاری ۴۱:۱۵)

بنجر زمین کو قابل کاشت بنانے پر کافی زور دیا گیا ہے اور ایسے کاشتکاروں کو خاص رعایت اور حقوق دیئے گئے ہیں (بخاری ۴۱:۱۵)۔ زمین کی ذاتی ملکیت کا حق دیا گیا ہے اور زمین کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ اپنی زمین کاشت کے لئے کسی دوسرے کو کرائے پر دے (بخاری ۴۱:۱۹)۔ لیکن اس کے ساتھ اس امر کی ہدایت بھی کی گئی ہے کہ جن کے پاس زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں وہ دوسرے غریب بھائیوں کو کرائے کے بغیر کاشت کے لئے دیں (مشکوٰۃ ۱۲:۱۳)۔ حکومت کا زمین کی پیدائش کا ۱/۱۰ حصہ پر حق ہے۔ جس زمین کو بارش یا قدرتی آبی وسائل سیراب کرتے ہوں۔ اور ۱/۲۰ حصہ پر حق ہے جن زمینوں کو کنوئے کے پانی سے سیراب کیا جائے (بخاری ۲۴:۵۵) جو شخص ہمسایہ کی زمین پر ناجائز تجاوز کرے اس کے لئے سخت ترین سزا

ہے (بخاری ۴۶:۱۴)

لین دین اور ادھار کے متعلق تمام معاملات کو تحریر میں لانے کی سخت تاکید ہے اور قرضدار کے حقوق کی حفاظت کی خاص تاکید کی گئی ہے (۲۸۲:۲)۔ انسان کو حتی المقدور قرضہ لینے سے پرہیز کرنا چاہئے (بخاری ۳۹:۳۔۴۳:۱۰)۔ قرض لینا اس نیت سے کہ اس کو واپس نہیں کرنا اس کی سخت مذمت کی گئی ہے (بخاری ۳۴:۱۷) قرضدار کو رعایت یا مہلت دینا یا اس کو معاف کر دینا جب اس کے حالات مخدوش ہوں نہایت مستحسن قرار دیا گیا ہے (بخاری ۳۴:۱۷)۔ اچھی بات ہے کہ قرض خواہ کو دی ہوئی رقم سے زیادہ رقم دی جائے (بخاری ۴۳:۷) قرض کی رقم کی ادائیگی میں تاخیر کرنا اس حالت میں کہ قرضدار اس کے ادا کرنے کے قابل ہو ناانصافی ہے بلکہ ایسے شخص کو سزا دینی چاہئے (بخاری ۴۳:۱۳) قرض کی ادائیگی کی ضمانت کے طور پر زمین کو رہن میں لینے کی اجازت ہے لیکن اس کے لئے کچھ شرائط رکھی گئی ہیں (۲۸۳:۲ بخاری ۴۳:۱، ۴۸:۹) سود کو حرام قرار دیا گیا ہے (۲۷۵:۲)

جس کسی کے پاس دولت ہے اس کو نیک کاموں کے لئے اپنی جائیداد کا ۱/۳ حصہ وصیت کرنا چاہئے (۱۸۰:۲ بخاری ۵۵:۱، ۲۳:۳۷)۔ متوفی کی جائیداد میں سے قرض ادا کرنے اور وصیت پر عملدرآمد کے بعد جو بچ جائے وہ مرد اور عورت رشتہ داروں میں قانون کے مطابق تقسیم کر دی جائے (۴:۱۱، ۱۲)۔ اگر کوئی قریبی یا دور کے رشتہ دار ورثہ لینے کے لئے موجود نہ ہوں تو مسلمان متوفی کی جائیداد حکومت کے سپرداری میں چلی جائے گی اور اگر مسلم حکومت نہ ہو تو مسلمانوں کی جماعت کے سپرد کر دی جائے گی۔

محترم بشارت احمد بقا صاحب

قادیانی مسئلہ اور لاہوری گروپ کی حیثیت۔ ۱۴

حضرت مولانا محمد علیؒ صاحب کی تحریر پر اعتراض کا جواب

قارئین "پیغام صلح" کے لئے یہ خبر انتہائی صدمہ اور افسوس کا باعث ہوگی کہ ہمارے نہایت عالم بزرگ جناب میاں بشارت احمد بقا صاحب جو گذشتہ ایک سال سے بیمار چلے آ رہے تھے ۱۸ اگست کو قضائے الٰہی سے وفات پا گئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم کے بلند پایہ خیال انگیز اور علم و معرفت سے پر مضامین نے تقریباً دو سال سے قارین کی علمی پیاس، دینی ایقان اور بصیرت کے لئے بیش قیمت مضامین اور تبصرے مہیا کرتے رہے۔ خاص طور پر پروفیسر غازی احمد صاحب کی کتاب "قادیانی مسئلہ اور لاہوری گروپ کی حیثیت" کے بارے میں ان کے مضامین کا سلسلہ خیالات اور قیمتی مواد کا ایک خزانہ ہے جو انہوں نے نہایت قابلیت اور محنت سے ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ اسی سلسلہ میں لکھے ہوئے متعدد مضامین ابھی باقی ہیں جو انشاء اللہ قارئین کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور دینی خدمت کا اجر ان کے لئے موجب ثواب دارین ہو۔

غازی صاحب فرماتے ہیں۔

"قادیانی لٹریچر میں ایسی متعدد تحریریں موجود ہیں جن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ جو شخص مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا ایک گونا نبی تسلیم نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں۔ مرزا صاحب نے اپنی کتاب "حقیقۃ الوحی" میں صاف طور پر لکھا ہے کہ وہ اور ان کے مخالفین ایک ہی وقت میں دونوں مسلمان نہیں سمجھے جاسکتے۔ مرزا محمود احمد کا بھی یہی موقف تھا۔ اس سلسلہ میں واضح ترین بیان مولوی محمد علی جماعت لاہور کے بانی کا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ تحریک احمدیہ کا اسلام سے وہی رشتہ ہے جو عیسائیت کا یہودیت سے ہے۔"

اس سلسلہ میں میرا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت مرزا صاحب نے کسی

جگہ نہیں لکھا اور نہ ہی زبانی بیان کیا ہے کہ جو شخص مجھے نبی تسلیم نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں۔ میں تکفیر اہل قبلہ کے مضمون میں حضرت مرزا صاحب کا مسلک اچھی طرح واضح کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ تکفیر اور تکذیب کی ابتدا مخالف علماء سے ہوئی جب حضرت مرزا صاحب نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا تو ہندوستان کے دو سو علماء کے دستخطوں سے آپ کے خلاف فتویٰ کفر جاری کیا گیا۔ تمام احمدیوں کا ملکی سطح پر بائیکاٹ کیا گیا۔ انہیں مساجد سے زبردستی باہر نکالا گیا۔ ان کے مردوں کو قبرستانوں میں دفن ہونے سے روکا گیا۔ چونکہ حضرت مرزا صاحب اور آپ کے متبعین خدا کے فضل سے کلمہ گو مسلمان تھے اور تمام امور شریعت اسلامی کے سختی سے پابند تھے۔ اس لئے انہیں کافر قرار دیئے جانے میں اللہ اور رسول صلعم کے واضح احکام کی صریح خلاف ورزی کی گئی چنانچہ حضرت مرزا صاحب نے حدیث نبویؐ کے تحت صرف یہ کہا کہ تمام مکفرین کا کفرالٹ کر خود ان پر پڑ گیا ہے اور جس قسم کا کافر وہ ہمیں قرار دیتے ہیں اسی قسم کے وہ خود کافر ہو گئے ہیں اور حضرت ممدوح نے اپنے اس موقف کو کبھی فراموش نہیں کیا تھا کہ ”ابتدا سے میرا یہی مذہب ہے کہ میرے دعویٰ کے انکار سے کوئی شخص کافر دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔“

بڑی حیرت کی بات ہے کہ وہ لوگ جو خدا کے مامور کو کاذب مفتری اور کافر قرار دیتے ہوں اور دن رات دشنام طرازی اور اس کی تباہی و بربادی کی سرتوڑ کوشش کرتے ہوں۔ وہ دونوں پھر بھی ایک ہی زمرہ کے افراد قرار دیئے جائیں۔ دنیا کی کوئی عدالت کسی مجرم اور گنہگار کو کسی بے گناہ اور معصوم عن الخطا کے ہم پلہ قرار نہیں دیتی پھر غازی صاحب اس کھلی ناانصافی کو کس اسلامی اصول کی بنا پر روا قرار دیتے ہیں۔ میں انہیں مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ از راہ انصاف تعصب کی عینک اتار کر حضرت مرزا صاحب کی کتاب حقیقتہ الوحی پڑھیں۔ انہیں نبوت اور تکفیر اہل قبلہ کے بارے میں حضرت اقدس کا مسلک پوری طرح سمجھ آجائے گا۔

مرزا محمود احمد صاحب نے جو مسلک اختیار کیا اس کی ذمہ داری حضرت مرزا صاحب پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہمارے نزدیک اس شخص کا کردار بھی وہی ہے جو مسیح موسوی کے بارے میں پولوس کا تھا۔

مولانا محمد علی صاحب کے بیان میں سے پہلا فقرہ نقل کر کے غازی صاحب نے بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ خود بھی غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں اور اپنے قارئین کو بھی سخت غلط فہمی میں مبتلا کیا ہے۔ میں مولانا صاحب مرحوم کا پورا بیان ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تھا۔

”احمدیہ تحریک کا اسلام سے وہی رشتہ ہے جو عیسائیت کو یہودیت سے تھا۔ یہاں عیسائیت سے مراد وہ عیسائیت نہیں جس پر اس وقت عمل کیا جاتا ہے یا جس کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ بلکہ وہ عیسائیت مراد ہے جسے اسلام ایک سچے مذہب کی صورت میں پیش کرتا ہے اور جس کی تعلیم حضرت مسیح (علیہ السلام) نے دی تھی۔ بہت بڑی خصوصیت جو عیسائیت کو یہودیت کے جملہ فرقوں میں متمیز کرتی تھی وہ تھی حضرت عیسیٰؑ کو عبرانیوں کا مسیح موعود تسلیم کرنا جن کی ذات میں اسرائیلیوں کی تمام امیدیں اور پیشگوئیاں پوری ہوگئیں تھی اور بہت بڑی خصوصیت جس سے احمدیہ تحریک کی جملہ فرقہائے اسلام میں شناخت ہوتی ہے وہ ہے بانی تحریک مرزا غلام احمد کو مسلمانوں کا مسیح موعود اور مہدی تسلیم کرنا۔ جس کی ذات میں اسلام کی عظمت اور آئندہ فتوحات کے بارے میں تمام امیدیں اور پیشگوئیاں پوری ہوگئی ہیں۔“ (ریویو آف ریلیجنز ماہ مئی ۱۹۰۶ء)

حضرت مولانا صاحب مرحوم کے اس بیان کے پڑھنے کے بعد آپ خود سمجھ گئے ہوں گے کہ جو الزام غازی صاحب نے حضرت مولانا صاحب پر لگایا ہے وہ کیسا بے سروپا اور بے بنیاد ہے۔ غازی صاحب کا بحیثیت ایک عالم دین کے اخلاقی فرض تھا کہ محض ایک فقرہ نقل کرنے کی بجائے اس فقرہ کے سیاق و سباق کو بھی پڑھا ہوتا اور جو سبکی انہیں اٹھانی پڑی ہے اس کی نوبت ہی نہ آتی۔

حضرت مولانا مرحوم کے اس بیان میں مسیح محمدی کی مسیح موسوی سے جو مشابہت تامہ نظر آئی ہے وہ بھی اپنی جگہ بڑی ایمان افروز ہے۔ یہود اب تک حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کی نبوت سے انکار پر اس لئے مصر چلے آرہے ہیں کہ ان کے نزدیک وہ پیشگوئیاں اور امیدیں جو آنے والے مسیح کی ذات سے وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ اسی طرح جملہ فرقہائے اسلام نے بھی جو امیدیں اور پیشگوئیاں اپنے آنے والے مسیح کی ذات سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ ان کے نزدیک پوری نہیں ہوئیں۔ للہذا پہلا مسیح گذشتہ دو ہزار سال سے یہودیوں کے زیر ملامت ہے اور دوسرا مسیح گذشتہ سو سال سے مسلمانوں کے زیر ملامت ہے۔ اگر کوئی دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دماغ ہو تو اس مشابہت سے ہی حضرت مرزا صاحب کی صداقت

عیاں ہو جاتی ہے۔

قادیان کی دمشق سے مشابہت اور حضرت مرزا صاحب کی حالت مریمی پر اعتراض ہے۔

غازی صاحب لکھتے ہیں کہ احادیث میں صاف اور صریح طور پر ذکر آیا ہے کہ مسیح ابن مریم دمشق میں نزول فرمائیں گے اور مسلمانوں کو دجال اعظم کے حملوں سے نجات دلائیں گے۔ مگر یہ مرزا ان احادیث کو اپنے اوپر اپنی عجیب و غریب تشریحات کے ذریعے چسپاں کرتا ہے۔ اس کے دعویٰ کے مطابق یہ اس پر الہاماً انکشاف ہوا ہے کہ دمشق لفظ سے اصل دمشق کا شہر مراد نہیں بلکہ اس سے ایسی جگہ مراد ہے جس میں بسنے والے لوگ یزیدیوں سے دینی برتاؤ کے لحاظ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ مرزا صاحب کے خیال کے مطابق دمشق کے لوگ اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہیں رکھتے وہ احکام الٰہی کا اکرام نہیں کرتے وہ اپنے خیالات اور سفلی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ اپنے ناپاک نفس کے اس حد تک غلام ہیں کہ انسانی روح کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور وہ آخرت پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ دمشق کے اسی قماش کے لوگ ہیں۔ مرزا نے دعویٰ کیا کہ قادیان کے لوگ بھی یہی خصوصیات رکھتے ہیں اس لئے قادیان دمشق کے مشابہہ ہے جہاں عیسیٰ نے نزول کرنا تھا۔" (ص ص ۳۱،۳۰)

اس سلسلہ میں پہلی غلط فہمی غازی صاحب نے یہ پیدا کی ہے کہ گویا حضرت مرزا صاحب نے اپنے زمانہ کے اہل دمشق پر یزیدی لوگوں کی صفات چسپاں کی ہیں۔ حالانکہ آپ کا روئے سخن صاف طور پر زمانہ خلافت یزید کے اہل دمشق کی طرف ہے۔ واقعہ کربلا دراصل معرکہ حق و باطل تھا اور تمام علماء اسلام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کے مقابلے میں حق پر قرار دیتے چلے آئے ہیں۔ اگر یزید اور اس کے امراء اور ان کی دیکھا دیکھی دمشق کے عوام اباحت اور بد عملی کا رستہ اختیار نہ کرتے تو جس طرح حضرت حسین اور خانوادہ رسول صلعم نے حضرت امیر معاویہ کو اپنا خلیفہ تسلیم کئے رکھا اور کوئی آواز بلند نہ کی۔ اسی طرح یزید کے زمانہ میں بھی ان کا رویہ ضرور معاونانہ ہوتا۔

قادیان کا حال بھی نہایت ناگفتہ بہ تھا۔ خود حضرت مرزا صاحب کے اپنے خاندان کے افراد اسلام کے بہت بڑے دشمن تھے۔ خدا کے وجود کے منکر اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کھلے بندوں گستاخیاں کرتے اور قرآن کو اپنے پاؤں کے نیچے رکھتے تھے۔ دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ سماجیوں کا قادیان میں زور تھا۔ ان کی طرف سے علی الاعلان اسلام اور بانی اسلام پر دشنام طرازی مسلسل ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس فتنہ عظیم کا قلع قمع کرنا ازبس ضروری تھا۔ تاہم اس زمانہ کا ہر عالم دین، ہر پیر اور شیخ بے حس اور بے جان تھا۔ دشمنوں کی ان چیرہ دستیوں کو دیکھ کر کسی کو غیرت نہ آئی اور یوں قادیان کی مماثلت دمشق سے پوری ہو گئی۔ حدیث دمشق میں جس قدر بیان ہوا ہے وہ زیادہ تر استعاروں سے پر ہے اور یہ بات ہر عالم دین پر عیاں ہے کہ پیشگوئیاں اپنے اصل الفاظ میں پوری نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کے باطنی معنے لینے پڑتے ہیں۔

میں غازی صاحب کو پھر دعوت دیتا ہوں کہ وہ حضرت مرزا صاحب کی تعبیر کو پھر غور سے پڑھیں۔ آپ اپنی کتاب "ازالہ اوہام" میں فرماتے ہیں۔

"پس واضح ہو کہ دمشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر منجانب اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ اس قصبہ کا نام دمشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطبع اور یزید پلید کی عادات اور خیالات کے پیرو ہیں جن کے دلوں میں اللہ اور رسولؐ کی کچھ محبت نہیں اور احکام الٰہی کی کچھ عظمت نہیں جنھوں نے اپنی نفسانی خواہشوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور اپنے نفس امارہ کے ایسے مطیع ہیں کہ مقدسوں اور پاکوں کا خون بھی ان کی نظر میں اسہل اور آسان ہے اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور خدا تعالیٰ کا موجود ہونا ان کی نگاہ میں ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جو انہیں سمجھ نہیں آتا اور چونکہ طبیب کو بیماروں کی طرف آنا چاہئے اس لئے ضرور تھا کہ مسیح ایسے لوگوں میں ہی نازل ہو۔ غرض مجھ پر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دمشق کے لفظ سے دراصل وہ مقام مراد ہے جس میں دمشق والی مشہور خاصیت پائی جاتی ہے اور خدائے تعالیٰ نے مسیح کے اترنے کی جگہ جو دمشق کو بیان کیا تو یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ مسیح سے مراد وہ اصلی مسیح نہیں ہے جس پر انجیل نازل ہوئی تھی بلکہ مسلمانوں میں سے کوئی ایسا شخص مراد ہے جو انسانی حالت کی رو سے مسیح سے اور نیز امام حسین سے بھی مشابہت رکھتا ہے کیونکہ دمشق پایہ تخت یزید ہو چکا ہے۔ اور یزیدیوں کا منصوبہ گاہ جس سے ہزارہا طرح کے ظالمانہ احکام نافذ ہوئے وہ دمشق ہی ہے اور یزیدیوں کو ان یہودیوں سے بہت مشابہت ہے جو حضرت مسیح کے وقت میں تھے۔ ایسا ہی حضرت امام حسین کو بھی اپنی مظلومانہ

زندگی کے رو سے حضرت مسیح سے غائت درجہ کی مماثلت ہے۔ پس مسیح کا دمشق میں اترنا صاف دلالت کرتا ہے کہ کوئی مثیل مسیح جو حسین سے بھی بوجہ مشابہت ان دونوں بزرگوں کی مماثلت رکھتا ہے۔ یزیدیوں کی تنبیہہ اور ملزم کرنے کے لئے جو مثل یہود ہیں اترے گا اور ظاہر ہے کہ یزیدی الطبع لوگ یہودیوں سے مشابہت رکھتے ہیں یہ نہیں کہ اصل یہودی ہیں اس لئے دمشق کا لفظ صاف طور پر بیان کر رہا ہے کہ مسیح جو اترنے والا ہے وہ بھی دراصل مسیح نہیں ہے بلکہ جیساکہ یزیدی لوگ مثیل یہود ہیں ایسا ہی مسیح جو اترنے والا ہے وہ بھی مثیل مسیح ہے اور حسینی الفطرت ہے۔ یہ نکتہ ایک لطیف نکتہ ہے جس پر غور کرنے سے صاف طور پر کھل جاتا ہے کہ دمشق کا لفظ محض استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔"

میں نے بخوف طوالت حضرت اقدس کی تشریح اور تعبیر کا بیشتر حصہ چھوڑ دیا ہے۔ البتہ میں سب قارئین کرام کو کہتا ہوں کہ آپ حضرات اپنی پوری تشفی کی خاطر حضرت اقدس کی کتاب "ازالہ اوہام" کے صفحات ۶۳ تا ۷۸ بغور مطالعہ فرمائیں۔ میں صرف مزید یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر انیسویں صدی میں پنجاب کے مسلمانوں کے حالات بالخصوص اور ہندوستان کے مسلمانوں کے بالعموم اپنے پیش نظر رکھے جائیں تو دمشق کے ساتھ قادیان کو جو مشابہت حضرت مرزا صاحب نے دی ہے اس کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ غازی صاحب نے اپنی ساری کتاب میں حیات و وفات مسیح پر قطعاً" کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔ اگر وہ قرآن و احادیث سے حیات مسیح ناصری ثابت کر دیتے تو پھر شاید اس دمشقی حدیث کو اس کے ظاہری الفاظ میں درست تسلیم کرنے کی گنجائش نکل آتی۔ مگر بصورت موجودہ اس کو اسی تشریح اور تعبیر کے ساتھ ہی لامحالہ ماننا پڑتا ہے جو حضرت اقدس مرزا صاحب نے فرمائی ہے۔

دوسرا اعتراض غازی صاحب نے حضرت مرزا صاحب کی حالت مریمی پر کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"یہ ثابت کرنے کے بعد کہ قادیان دمشق ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس غرض کے لئے ان کے ذہن دماغ نے ایک بڑی دلچسپ تاویل ڈھونڈ نکالی۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے "براہین احمدیہ" کے حصہ سوم میں میرا نام مریم رکھا۔ دو برس تک صفت مریمیت میں میں نے پرورش پائی اور میں نسوانی حجاب میں بڑھتا رہا پھر عیسیٰ کی روح مجھ میں پھونکی گئی، جس طرح مریم کے اندر نفخ کی گئی تھی۔ اسی طرح میں استعارۃ" حاملہ قرار دیا گیا۔ کئی ماہ کے بعد جو دس ماہ سے زیادہ نہ تھے میں مریم سے عیسیٰ بنایا گیا اس الہام کے مطابق جو سب سے آخر "براہین احمدیہ" کے حصہ چہارم میں درج ہے۔ پس اس طور سے میں ابن مریم ٹھہرا اور خدا نے "براہین احمدیہ" کے وقت میں اس سر مخفی کی مجھے خبر نہ دی۔" (ص ۳۱)

غازی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ براہین احمدیہ ہرچہار حصص ۱۸۸۴ء میں چھپ کر شائع ہو گئی تھی اور اسی کتاب کے اندر حضرت مرزا صاحب نے مجدد الوقت ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا تھا۔ انہی کے اندر آپ نے اپنی اس روحانی کیفیت کا اظہار بھی فرما دیا تھا جسے اب غازی صاحب نے محل اعتراض ٹھہرایا ہے۔ چونکہ ان کی عقل عالم محسوسات تک ہی محدود ہے یا تحریک احمدیہ کی دشمنی کے باعث انہوں نے اپنی عقل کو عالم محسوسات میں محبوس کر دیا ہے۔ اس لئے انہوں نے حضرت اقدس کی اس حالت کو مضحکہ خیز قرار دیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں جب "براہین احمدیہ" اس زمانہ کے جید اور نامور علماء کے ہاتھوں میں گئی تھی تو کیا کسی عالم دین نے حضرت مرزا صاحب کی اس روحانی کیفیت کو ہدف تنقید بنایا تھا۔ میں بڑے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ کسی ایک جگہ سے بھی حضرت ممدوح کے ان روحانی مدارج کے خلاف کوئی آواز نہ بلند ہوئی تھی۔ یہ اس لئے کہ وہ تمام بزرگان دین جو علماء امتی کانبیا بنی اسرائیل کا مقام رکھتے تھے وہ سورہ تحریم کی آخری دو آیات میں بیان کردہ مومنین کامل کی صفات سے متصف سمجھے جاتے تھے اور انہیں عیسیٰ ابن مریم بننے کے لئے استعارۃ" ان تمام کیفیات میں سے گزرنا پڑتا تھا جن کا ذکر حضرت اقدس مرزا صاحب نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "براہین احمدیہ" میں کیا تھا۔ کاش غازی صاحب حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے اس بیان پر ہی غور کرتے۔

دمبدم روح القدس اندر معینے می دمد
من نمی گویم مگر من عیسیٰ ثانی شدم

اور حضرت مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کے مندرجہ ذیل اشعار کو ہی پڑھا ہوتا۔

آخر ایں جاں بابدن پیوستہ است
ہیچ ایں جاں بابدن مانستہ است

تاب نور چشم باپیہ ست جفت
نور دل در قطرۂ خونے نہفت
شادی اندر گردہ و غم در جگر
عقل چوں شمع درون مغز سر
رائحہ در انف و منطق در لساں
لہو در نفس و شجاعت در جناں
این تعلقہا نہ بے کیف ست و چوں
عقلہا در دانش چونی زبوں
جان کل باجان جز آسیب کرد
عقل ازو درے ستددر جیب کرد
ہمچو مریم جاں ازاں آسیب جیب
حاملہ شد از مسیح دلفریب
آں مسیحے نے کہ برخشک و تر ست
آں مسیحے کز ساحت برتر ست
پس زجان جاں چو حامل گشت جاں
از چنیں جانے شود حامل جہاں
پس جہاں زائد جہانے دیگرے
ایں حشر او را نمائد محشرے
تاقیامت گر بگویم شمرم
من زشرح ایں قیامت قاصرم

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے۔ جس طرح انسان کی جان کا تعلق بدن سے ہے آنکھ کے نور کا لوتھڑے سے تعلق ہے۔ جس طرح خوشی کا گردے سے اور غم کا جگر سے تعلق ہے۔ جس طرح عقل کا دماغ سے اور بولنے کا زبان سے تعلق ہے۔ جس طرح لہو و لعب یعنی عیش و عشرت کا نفس سے اور شجاعت کا بازوؤں سے تعلق ہے جنہیں انسان سمجھ نہیں سکتا کہ کس طرح ایک غیرمادی چیز کا مادی چیز سے تعلق ہوتا ہے۔ مگر انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ سب تعلقات موجود ہیں۔ اسی طرح کل کا جزو کے ساتھ یعنی اللہ تعالیٰ کی روح کا انسان کی روح کے ساتھ تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اسی تعلق سے جس طرح عورت مرد سے نطفہ لیتی ہے اسی طرح عقل انسانی اس سے ایک موتی حاصل کرتی ہے۔ پھر انسان کی جان مریم کی طرح اس تعلق سے حاملہ ہوتی ہے اور اس حمل سے مسیح پیدا ہوتا ہے۔ یعنی وہ بندہ حالت مریمی سے حالت مسیح ابن مریم کی طرف ترقی کر جاتا ہے یہ مسیح جو بنتا ہے وہ مسیح نہیں ہوتا جو زمانہ ماضی میں گزر چکا بلکہ یہ مسیح وہ ہوتا ہے جس کی شان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی روح سے جب انسانی روح حاملہ ہوتی ہے تو اس روح سے ایک جہان پیدا ہوتا ہے جسے ایک روحانی قیامت کہنا چاہئے اور جو اس قدر شاندار ہوتا ہے کہ اس کی شرح اگر میں قیامت تک بیان کروں تو ختم ہونے کو نہ آئے۔

رہی وہ بات جسے خدا نے "براہین احمدیہ" کے زمانہ میں سر مخفی رکھا وہ صرف یہ تھی کہ خدا تعالیٰ نے آپ پر ظاہر نہیں فرمایا تھا کہ مسیح ابن مریم عمر طبعی پا کر وفات پا چکے تھے اور جس مسیح نے آخری زمانہ میں ظہور کرنا تھا وہ آپ کی ذات گرامی تھی۔ قصہ کوتاہ غازی صاحب نے جس بات کو مضحکہ خیز قرار دیا ہے وہی بات حضرت مرزا صاحب کے مقام عالی کی گواہی دیتی ہے۔ حضرت اقدس نے اپنی اس روحانی کیفیت کا ذکر خصوصی طور پر اپنی ایک فارسی نظم میں بھی کیا ہے۔ آپ کا وہ منظوم کلام ہدیہ قارئین کرام ہے۔

آنکہ گوئند ابن مریم چوں شدی
ہست او غافل ز راز ایزدی
آں خدائے قادر و رب العباد
در براہین نام من مریم نہاد
مدتے بودم برنگ مریمی
دست نادادہ بہ پیران زمی
ہمچو بکرے یافتم نشوونما
از رفیق راہ حق ناآشنا
بعد ازاں آں قادر و رب مجید
روح عیسیٰ اندراں مریم دمید
پس بہ نفخش رنگ دیگر شد عیاں
زاد زاں مریم مسیح ایں زماں
زیں سبب شد ابن مریم نام من
زانکہ مریم بود اول گام من
بعد ازاں از نفخ حق عیسیٰ شدم
شد زجائے مریمی برتر قدم
ایں ہمہ گفت است رب العالمین
گر نمیدانی براہین راببیں

حکمت حق راز ہا دارد بسے
نکتہ مستور کم فہمد کسے
فہم را فیضان حق بائید نخست
کار بے فیضاں نمی آئید درست
گر نہ داری فیض رحماں را پناہ
ظلمتے در ہر قدم داری براہ
فیض حق را باتضرع کن تلاش
ہاں مرو چوں توسنے آہستہ باش

ان احباب کی سہولت کے لئے جو فارسی زبان نہیں جانتے اس نظم کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔

جو شخص کہتا ہے کہ تو ابن مریم کس طرح بن گیا وہ خدائی راز سے غافل ہے۔ اس قادر خدا اور رب العباد نے "براہین احمدیہ" میں میرا نام مریم رکھا تھا۔ میں ایک مدت تک مریم کے رنگ پر رہا یعنی میں نے زمانہ کے مشائخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دیا۔ میں نے ایک کنواری لڑکی کی طرح پرورش پائی اور کسی عارف کامل سے شناسائی نہ تھی۔ اس کے بعد اس قادر اور مجید خدا نے اسی مریم میں عیسیٰ کی روح پھونک دی۔ پھر اس نفخ کے بعد ایک اور رنگ ظاہر ہوا یعنی اس مریم سے اس زمانے کا مسیح پیدا ہوا۔ میرا نام مسیح ابن مریم اس لئے ہوا کہ مریم بننا میرا پہلا قدم تھا۔ پھر میں خدائی نفخ کے سبب سے عیسیٰ ہو گیا اور مقام مریمی سے میرا مقام اونچا ہو گیا۔ یہ سب باتیں رب العالمین کی فرمودہ ہیں اگر تجھے علم نہیں تو "براہین" کو دیکھ۔ خدائی حکمت میں بہت بھید ہوتے ہیں ان باریک نکتوں کو لوگ کم سمجھتے ہیں۔ فہم کے لئے پہلے خدا کا فیضان درکار ہے۔ بغیر فیض الٰہی کے کوئی کام ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ اگر تو رحمٰن کے فیض کی پناہ نہیں رکھتا تو میرے ہر قدم پر اندھیرا ہی اندھیرا ہے تو گریہ زاری کر کے خدا کا فیض تلاش کر۔ یوں گھوڑے کی طرح بھاگا نہ جا بلکہ آہستہ چل۔ (حقیقۃ الوحی ص ص ۳۲۹، ۳۳۰، ۱۹۰۷ء)

(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "اہل حدیث مولوی عبدالقیوم کی تقریر کا جواب" شمارہ جنوری، فروری ۱۹۹۸ء صفحات ۱۵ تا ۱۹)

محمد ہارون، لندن

اسلام میں عائلی زندگی کا تصور

اس تقریر کا متن جو ۱۶ جنوری ۱۹۹۹ء کو احمدیہ ہاؤس، لندن کے ماہوار اجلاس میں کی گئی

بحیثیت ایک فرد کے ایک ہی وقت میں وہ اگر خاتون ہے تو ماں بھی ہو سکتی ہے۔ دادی بھی، بیوی بھی، بہن بھی، بیٹی بھی، خالہ بھی یا بھتیجی بھی۔ اسی طرح اگر وہ مرد ہے تو ایک ہی وقت میں وہ باپ ہو سکتا ہے، دادا بھی، خاوند بھی، بھائی بھی، بیٹا بھی، چچا بھی یا بھتیجا بھی۔ یہ امر تو یہاں سب حاضرین پر بالکل عیاں ہے مگر ہمارے زمانہ میں کئی ایک سماجی نظام ایسے بھی ہیں جس میں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی کہ آیا وہ فرد بیوی ہے یا خاوند، ماں ہے یا باپ وغیرہ وغیرہ۔

مثال کے طور پر مغرب میں آزاد اور آزاد منش سماجی حلقوں میں جہاں فرد سوسائٹی کا بنیادی اکائی سمجھا جاتا ہے، ہر شخص آزاد ہے کہ وہ جب چاہے اور جو چاہے کرے کیونکہ ہر شخص کو اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے میں آزاد سمجھا جاتا ہے۔

مثلاً ایک عورت آزاد ہے کہ وہ ایک یا ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ رہے حتیٰ کہ عورتوں کے ساتھ بھی۔ اور ایک مرد کسی کا باپ ہو سکتا ہے بغیر جانے کہ وہ کس کا باپ ہے اور اس کے بچہ یا بچیوں کو پتہ نہیں ہوتا کہ ان کا باپ کون ہے۔ دوسری طرف ایسے سماجی نظام ہیں جن میں فرد کی کوئی خاص وقعت نہیں ہوتی اور کمیون یا ریاست تمام اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ ان حالات میں بچوں کی پرورش ایک انڈسٹری بن جاتی ہے۔ حفظان صحت، تعلیم اور دیگر ضروریات پبلک ذمہ داری بن جاتی ہیں۔ سو اس نظام کے تحت ماں باپ ہونا اپنے ساتھ کوئی خاص ذمہ داری کا حامل نہیں ہوتا۔ بظاہر ایسے نظام میں ممکن ہے کہ مادی آرام یا مادی ذمہ داریوں سے آزادی زیادہ ہو۔ مگر ان رشتوں سے جو چیز غائب نظر آتی ہے وہ ہے محبت اور گرم جوشی اور اس طرح انسانی وجود بے قدر و قیمت کر دیا جاتا ہے اور فطری رشتے اور ضرورتیں دبا دی جاتی ہیں یا معدوم کر دی جاتی ہیں۔

آج یہ حقیقت عیاں ہو گئی ہے کہ سماج کی بنیادی اکائی ایک فرد یا کمیون نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں نظام ناقابل عمل ہیں چونکہ ان نظاموں میں افراد بے حد ذہنی دباؤ اور کئی سماجی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص عورتیں اور بچے' جو سماجی بدنظمی کی وجہ سے بے راہروی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف اسلام انسان کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ محض ایک فرد ہی رہے' جو آزاد ہو اور جو چاہے اور جب چاہے کرے! کوئی بھی سماج فرد واحد کو سوسائٹی کا بنیادی اکائی بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اسے ہر قسم کی آزادی دے دیتا ہے تو دراصل وہ فطری رشتوں اور فطری حاجتوں کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتا!

قرآن شریف فرماتا ہے:

"اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے اسے تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور اسے تکلیف سے جنا اور اس کا حمل میں رکھنا اور اس کا دودھ چھڑانا تیس ماہ تک ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچتا ہے اور چالیس سال میں کہتا ہے۔ میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھے اور میرے ماں کو دی اور میں نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو اور میرے لئے میری اولاد کی اصلاح کر' میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔"

اسلام میں فطرت کی راہ سے سماج کی بنیادی اکائی خاندان ہے۔ اسلام میں خاندان کے ادارہ کو مستحکم رکھنے اور خاندان کے اندر باہمی رشتوں کو قائم رکھنے کے بارے میں بہت سے قوانین موجود ہیں۔ کیونکہ اگر خاندان کو قائم رکھنا مقصود ہو اور بچوں کی شناخت اور پرورش کو محفوظ کرنا ہو' تو لازم ہے کہ زنا اور حرام کاری کی سخت ترین سزا دی جائے۔

"اور زنا کے قریب مت جاؤ کیونکہ وہ بے حیائی کی بات ہے اور بری راہ ہے۔" (۱۷:۳۲)

اسلام میں تین عوامل ہیں جو خاندان کو باہم مضبوطی سے اکٹھا رکھتے ہیں:

۱۔ خونی رشتے
۲۔ ازدواجی ذمے داریاں
۳۔ دین

قرابت داری اور خونی رشتے سب سے مضبوط فطرتی بدھن ہیں۔ ماں کا اپنے بچے کے لئے جو پیار ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک بچے کا اپنے پیار کرنے والے اور خیال رکھنے والے والدین کے لئے اخلاص اور تشکر کا رویہ اور جذبہ ان سب کا کوئی نعم البدل نہیں۔

ان رشتوں کی اہمیت اور مضبوطی کی وجہ سے نبی کریم صلعم نے اس بارے میں فرمایا:

"جو شخص قطع رحمی کرتا ہے وہ مجھ میں سے نہیں۔"

اور آپ صلعم نے مزید فرمایا:

"کسی گناہ کی اتنی سخت سزا نہیں ملتی جتنی ظلم اور قطع رحمی کی!"

ازدواجی ذمہ داریاں بھی خاندان کو اکٹھا رکھتی ہیں۔ کیونکہ اسلام جنسی تعلقات اور بچوں کی پرورش اور نگہداشت کے لئے شرعی شادی کے ڈھانچے سے بہتر اور کوئی ڈھانچہ خاطر میں نہیں لاتا۔ فریقین کی ذاتی سطح پر باہمی رضامندی سے جنسی اختلاط' عام قانون کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ رہنا' آزمائشی یا عارضی شادیاں' یہ سب اسلامی تفہیم کے لحاظ سے خاندان کے زمرہ میں نہیں آتے۔

دین وہ تیسرا عامل ہے جو خاندانی بندھن کو مضبوط اور مستحکم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے' یعنی اسلام کے ساتھ مکمل وفاداری۔ اگر خاندان کے سب افراد مسلمان ہوں تو مشترک مفاد اور دلچسپیوں کی وجہ سے ہم آہنگی کا زیادہ امکان ہے بہ نسبت اس کے کہ خاندان کے مختلف افراد اپنی اپنی راہ پر چل نکلیں اور مختلف ادیان اختیار کئے ہوئے ہوں۔

بعض حالات میں دین ازدواجی ذمہ داریوں اور خاندانی رشتہ داریوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اسلام ہر شخص سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ والدین سے محبت کرے اور ان سے نہایت عزت و احترام سے پیش آئے چاہے وہ مسلمان نہ بھی ہوں۔ مگر اگر یہ والدین خدا کے فرمانوں کی حکم عدولی کا کہیں یا ایک خدا پر ایمان نہ لانے کو کہیں اسلام ان حالات میں اس سے فرماں برداری کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان اپنے آپ کو اپنے والدین یا بچوں کے خلاف میدان جنگ میں صف آراء ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر وہ اسلام کی مخالفت کریں یا اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کی بیخ کنی کرنے کے درپے ہوں جائیں۔ تاریخ اسلام میں اس بات کی کئی مشہور و معروف مثالیں موجود ہیں۔ حضرت نوحؑ نبی اللہ اپنے نافرمان بیٹے کو طوفان سے

بچا سکے۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بت پرست باپ کی مثال ہے اور ایک واقعہ حضرت لوطؑ اور ان کی بدکار بیوی کا ہے حضرت محمد صلعم کے وقت میں ان کے اصحاب کی مثال بھی موجود ہے کہ ان میں سے کئی ایک اپنے باپ یا بیٹے تک سے نبرد آزما ہوئے۔

"اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ سے نیکی کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے اور اگر وہ تجھ پر زور دیں کہ تو میرے ساتھ (دوسروں کو) شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان، تمہیں میری طرف لوٹ کر آنا ہے پس میں تمہیں بتاؤں گا جو تم کرتے تھے۔" (۸:۲۹)

اسلام میں خاندان کے مفہوم کو وسیع کر کے اس میں نانا، دادا، نانی دادی پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں، چچا ماموں، خالائیں پھوپھیاں اور ان کے بچے سب شامل کر دیئے گئے ہیں۔ ان رشتوں کو قانوناً مضبوط بنایا گیا ہے۔ مثلاً جیسے قانون کفالت اور قانون وراثت! وسیع تر خاندان کو محفوظ تر بنا کر نسلوں کے درمیان جو فطری اور مسلسل ربط قائم رکھنے کا بندوبست کر دیا گیا ہے اور نئی نسلیں بڑے آرام اور آسانی سے اپنے کلچر، عادات اور دینی اقدار کو سیکھ جاتی ہیں۔

ایک وسیع تر خاندان میں ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے اور دکھ سکھ بانٹنے والے ماحول میں آپس میں گرم جوشی اور روابط میں زرخیزی و گیرائی پیدا ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ جہاں خاندان کے افراد ایک دوسرے کے ساتھی اور ہم جولی کا کردار ادا کرتے ہیں اور اس طرح زندگی کے گوناگوں مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں زیادہ سہولت رہتی ہے اور اس طرح تنہائی، خود غرضی اور انفرادیت کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کافی حد تک کم ہو جاتے ہیں۔

وسیع تر خاندان کئی طریقوں سے کام کرتا ہے مثلاً دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ بچوں کا خوشی سے خیال رکھتے ہیں اور اس طرح ماں کو موقعہ مل جاتا ہے کہ وہ گھر سے باہر اپنے فرائض ادا کر سکے اور دوسرے لوگ اپنے اپنے پیشہ ورانہ مقاصد کو بہتر طریق پر حاصل کرنے کی سعی کر سکتے ہیں۔ یہ امداد باہمی گھر کے اندر خوبصورتی اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ انفرادی کمزوریوں اور تنگ ظرفی اور بعض غیر فطری طرز عمل کی وجہ سے ایسا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔

والدین کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی پرورش کریں اور ان کی کفالت کریں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بچہ ابھی رحم مادر میں ہی ہوتا ہے تو ماں باپ کی ذمہ داریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ جب ایک مرد و عورت آپس میں شادی کرنا اور بچے پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان کا ایک دوسرے کا انتخاب دولت، حسن، حسب نسب یا تقویٰ پر منحصر ہوتا ہے۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ یہ آخری وصف سب سے اہم ہے۔ اس لئے والدین کی ذمہ داری اس رشتہ میں منسلک ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے جس میں دونوں کو صحیح عقائد، صحیح انداز فکر اور مستحسن طرز عمل کے ذریعہ آنے والی ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ حضور صلعم نے ہر جوڑے کو دوران خلوت نیک اور شریف اولاد کے لئے دعا کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ حمل ٹھہرنے سے قبل اور بعد میں بالخصوص والدہ کو اس بات کو یقینی بنانا چاہئے کہ اس کی طرز زندگی خالصتاً اسلامی ہو اس لئے اس کی جسمانی حالت پیدا ہونے والے بچہ پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اسے اس بات کو بھی یقینی بنانا چاہئے کہ وہ کوئی مضر ادویات نہ کھائے اور بحیثیت ایک مسلمان اسے شراب، سگریٹ، منشیات مثلاً کوکین وغیرہ کے استعمال سے بالکل اجتناب کرنا چاہئے۔ مختصراً یہ کہ اسے چاہئے کہ ہونے والے بچہ کے لئے پہلے ہی سے ایک نہایت موزوں، مستحکم اور خوش آئند ماحول مہیا کیا جائے تاکہ اس کی تربیت میں کسی قسم کی کمی نہ رہ جائے۔

جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو ماں کا کردار بڑا اہم ہو جاتا ہے کیونکہ اسے اپنی زندگی کے سب سے بڑے چیلنج اور ذمہ داری کا سامنا ہوتا ہے۔ خصوصاً جس دوران کہ بچہ ابھی دو سال سے کم عمر کا ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے مطابق یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ بچہ ماں کا دودھ پیتا اور ماں کو بچے کو ہر طرح کا آرام و آسائش اور تربیت مہیا کرنا ہوتی ہے۔

ان لوگوں کی باتوں کی طرف بالکل دھیان نہ دیں جو کہ اصرار کرتے ہیں کہ سوسائٹی کو تمام بچوں کی نگہداشت کرنی چاہئے یہ درحقیقت خاندانی ڈھانچہ کو معدوم کرنا چاہتے ہیں اور عورتوں کو آزادی نسواں کے نام پر پبلک سرگرمیوں میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یوگوسلاویہ کے ایک مسلمان مصنف، عالی جاہ علی عزت گووچ کی کتاب "اسلام، مشرق و مغرب کے درمیان!" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ "جدید تہذیب نے بالخصوص ماں کے منصب کو ذلیل کر دیا ہے اس نے ایک سیلز گرل، ماڈل، دوسروں کے بچوں کو

پڑھانے والی ٹیچر' سیکرٹری' صفائی والی عورت وغیرہ وغیرہ کو ماں پر ترجیح دی ہے۔ اس نے ماں ہونے کو غلامی سے تشبیہ دی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ وہ عورتوں کو اس سے نجات دلائے گی۔ وہ مصنوعی پیدائش اور مصنوعی موت کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ یہ دونوں طریق خاندان کے تصور کے خلاف ہیں اور انسانی زندگی میں عورت کے تبدیل شدہ کردار کا نتیجہ ہیں اور ان مصنوعی طریق معاشرت میں درحقیقت والدین کا کردار ختم ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نرسری میں بچے والدین سے اور بوڑھے گھروں میں والدین اور بچوں سے محروم رہتے ہیں اور اس طرح گھروں میں بچوں کے لئے والدین اور بزرگوں کی سرپرستی کا ماحول ہی پیدا نہیں ہو پاتا۔

بلا شک بچہ کی تربیت میں والد کا بھی ایک بڑا حصہ ہوتا ہے۔ تربیت کے مفہوم میں اپنے زیر نگہداشت بچہ کے متعلق ایک خصوصی احساس کا ہونا بھی شامل ہے۔ اس بات کا احساس کہ بچہ کی جذباتی اور جسمانی ضروریات کیا ہیں۔ اس میں باہمی اعتماد کو پیدا کرنا بھی شامل ہے۔ اس کے مفہوم میں نئی چیز بنانے اور نئی نئی راہوں اور طریقوں کے متعلق تجربہ کرنے کے جذبہ کو ابھارنے کی اجازت اور حوصلہ افزائی بھی شامل ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ بجائے گھٹن پیدا کرنے کے اعتماد پیدا کیا جائے اور جب ضرورت ہو تو سختی بھی کی جائے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو پابندیاں بھی عائد کی جائیں۔ اس تربیت کے عمل کی اولین ذمہ داری ماں باپ دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ شروع کے ان سالوں میں جبکہ بچہ ہر قسم کا اثر قبول کرتا ہے۔ بچہ کی تعلیم اور نشوونما میں ماں اور باپ دونوں کا کردار فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اس بارے میں حضور صلعم کی ذیل کی حدیث خاص اہمیت کی حامل ہے۔

"ہر بچہ مسلم یعنی فطری طور پر نیک پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس کے والدین ہیں جو اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔

اسلام میں مختلف رشتوں کی باہم ذمہ داریوں کے تانے بانے کو دیکھا جائے تو نہ صرف والدین بلکہ ددھیال اور ننھیال یعنی دادا دادی' نانا نانی' چچا چچی' ماموں خالہ' بھائی بہن' استاد اور محلہ دار سب کا نئی نسل کی پرورش میں ایک اہم کردار ہوتا ہے۔

بحیثیت دادا دادی یا نانا نانی کے وہ زندگی کے تجربات کی روشنی میں بچوں سے خوشیاں بھی حاصل کر سکتے ہیں اور بچوں کو بہت کچھ دے بھی سکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ والدین جو کہ زندگی کی نت نئی ذمہ داریوں کی وجہ سے کافی تناؤ میں ہوتے ہیں انہیں کافی حد تک سہولت مہیا کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں ہمیں حضور صلعم کی حضرت فاطمہؓ کا خیال رکھنا اور اپنے نواسوں حسن حسین کے ساتھ محبت و الفت سے پیش آنا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ روایت ہے کہ

"ایک شخص اقرع بن حابس تمیمی حضور صلعم کو ملنے آیا اور اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ حضورؐ اپنے دونوں نواسوں حسن اور حسین کے ساتھ کھیل رہے ہیں اور انہیں چوم رہے ہیں۔ اقرع نے حضور صلعم سے پوچھا۔

"کیا آپ اپنے بچوں کو چومتے ہیں؟" تب اس نے بیان کیا کہ اس کے دس بچے ہیں اور اس نے کسی ایک کو بھی کبھی چوما نہیں۔

حضور صلعم نے جواب دیا "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دل میں رحم اور نرمی بالکل موجود نہیں۔ جو لوگ دوسروں کے ساتھ رحم سے پیش نہیں آتے اللہ تعالیٰ ان سے بھی رحم سے نہیں پیش آئے گا۔" (بخاری ۱۸:۷۸)

یہ افسوس کی بات ہے کہ بہت سے بچوں کو دادا دادی' نانا نانی کی محبت اور صحبت کے فوائد سے محروم کر دیا جاتا ہے حالانکہ وہ اپنے پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں سے بے حد پیار کرتے ہیں اور پرورش میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔ اسی طرح مخصوص مسلم نیوکلیئر فیملی کی طرف رجحان دراصل بچوں کو مفلس تر بنانے والا رجحان ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

"اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ سے نیکی کرو۔ اگر تیرے سامنے دونوں میں سے ایک یا دونوں ہی بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف تک نہ کہہ اور نہ ان کو ڈانٹ اور ان دونوں سے ادب سے بات کرنا۔" (۲۳:۱۷)

والدین فطرتی طور پر بچوں سے محبت اور مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ جبکہ بچے اکثر والدین کی نافرمانی کرتے ہیں اور ان کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ایک تو اس وجہ سے اور دوسرے بوجہ اس عظیم قرض کے جس کے بچے والدین کے مقروض ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس بات کو لازمی ٹھہرایا ہے کہ بچے والدین کے ساتھ مکمل اچھائی اور رحم کا سلوک کریں۔ تاہم دوسری طرف قرآن کریم نے والدین کے اوپر اسی قسم کی ذمہ داری نہیں ڈالی۔ بس یہ ایک بالغ مسلمان کا فرض

ہے کہ وہ تمام عمر والدین کے ساتھ رحم اور اچھائی کا سلوک کرے اور یہ حکم ان والدین کے بارے میں بھی ہے جو کہ مسلمان نہیں۔ اس حکم سے وہ والدین مستثنیٰ ہیں جو شرک کا پرچار کرتے ہیں یا بچوں کو ایسے فعل کی طرف ترغیب دینے میں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ صرف انہی باتوں میں بچے والدین کی نافرمانی کر سکتے ہیں۔ بچہ خواہ کسی عمر کا بھی ہو اس کا فرض ہے کہ وہ والدین سے محبت و تشکر کا اظہار کرے۔ ان سے پیار سے بات کرے، انہیں خوش اور راضی کرنے کی سعی کرے اور جب وہ بوڑھے ہو جائیں اور خود اپنی ضروریات و حاجات کو پورا نہ کر سکیں تو بچے کو چاہئے کہ ان کی ضروریات کا خیال رکھے۔

والدین کے ساتھ نیک اور مہربانی کا سلوک کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ نیکی اور مہربانی نسل در نسل منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے حضور صلعم نے فرمایا۔

"اپنے والدین کے ساتھ نیک اور مہربان رہو۔ تمہارے بچے تمہارے ساتھ نیک اور مہربان رہیں گے۔"

ایک شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنی والدہ سے بالخصوص لطف و تشکر سے پیش آئے جس طرح والدہ نے اس کی خاطر مصیبتیں و اذیتیں اٹھائی ہوتی ہیں اور جس طرح اس کے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے تک اس کی پرورش کرتی ہے ان سب باتوں کا اظہار ممنونیت و تشکر سے کرتا ہے۔ فرمایا حضور صلعم نے فرمایا:

"جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔"

کسی نے حضور صلعم سے پوچھا کہ وہ کس کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے۔ حضور صلعم نے جواب دیا:

"تمہاری والدہ! آدمی نے پوچھا: "اس کے بعد کون آتا ہے"؟ حضور صلعم نے پھر فرمایا: "تمہاری والدہ! تیسری بار وہی سوال ہوا اور پھر وہی جواب دیا گیا! اس نے پھر پوچھا: اس کے بعد کون آتا ہے؟" تو فرمایا "تمہارا والد! پھر تمہارے رشتے دار درجہ بدرجہ۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اسلام میں کس طرح خاندان کو رشتوں کے ذریعہ مضبوطی سے باندھ دیا گیا ہے اور خاندان ازدواجی رشتوں اور دوسرے مجاز تعلقات سے بھی باہم مربوط رہتا ہے مگر ان سب سے بالاتر جو چیز ہے وہ ہے اسلامی اقدار اور نیک اعمال سے متعلق مثبت رویے اپنانے سے خاندانی زندگی میں نشوونما اور ترقی ہوتی ہے۔

چاہئے کہ گھر میں اسلامی اقدار جیسے یقین محکم، ایمان، محبت، رحمدلی، طہارت اور حسن سلوک کو پروان چڑھایا جائے۔ مختصراً یہ کہ ایک مثالی اسلامی گھر کو پروان چڑھایا جائے جس میں:

۱۔ سادگی ہو نہ کہ نمود و نمائش، کیونکہ حضور صلعم نے فرمایا: "کھاؤ پیؤ، صدقہ دو، اچھے کپڑے پہنو، مگر اس حد تک کہ یہ چیزیں اسراف اور غرور تک نہ پہنچ جائیں"۔

۲۔ گھر صاف ستھرا ہو کیونکہ حضور صلعم نے فرمایا "صفائی ایمان کا جزو ہے"۔

۳۔ گھر ہر قسم کے مجسموں اور دوسرے ناپسندیدہ فن پاروں سے پاک ہو کیونکہ حضور صلعم نے فرمایا "اللہ مجسم حسن ہے اور حسن کو پیار کرتا ہے"۔

۴۔ گھر ایسا ہو جہاں زندگی کی ساری ضروریات کھانا اور کپڑے وغیرہ مہیا ہوں۔ جہاں کھانا سب اکٹھے بیٹھ کر کھاتے ہوں اور جہاں مہمان نوازی اور فیاضی موجود ہو۔

۵۔ گھر ایسا ہو جہاں پر سلام کی آواز صبح و شام سنائی دے اور اس میں داخل ہونے اور باہر جانے کے وقت بھی۔

۶۔ گھر ایسا ہو جہاں نرمی، محبت اور رحم زندگی کا معمول ہو کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے: "ہم نے تمہارے درمیان محبت و الفت ڈال دی"۔

۷۔ گھر ایسا ہو جہاں تلاوت قرآن کریم اور ادائیگی نماز روزمرہ کا معمول ہو اور جہاں علم سکھایا جاتا ہو اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہو۔ مختصراً یہ کہ ایک مسلم گھرانہ فقط خاوند، بیوی اور بچوں پر مشتمل "نیوکلیئر فیملی" ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ وسیع تر خاندان ہوتا ہے اور سب رشتے دار اس میں شامل ہوتے ہیں۔ بحیثیت ایک مسلمان کے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ قریبی اور محبت بھرے تعلقات رکھے اور ان کا ہر طرح سے خیال رکھا جائے۔ حضور صلعم کا فرمان ہے کہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ رشتہ داروں سے ملنے جائے، ان کے حالات معلوم کرے ان پر خرچ کرے اور اگر وہ مستحق ہوں تو انہیں صدقہ دے۔

ابو طلحہؓ مدینہ کے امیر ترین آدمیوں میں سے تھے۔ ان کے کھجوروں کے باغات اور ان کی سب سے پسندیدہ ملکیت ایک باغ بیرحی کے نام سے تھا اور باغ مسجد نبوی کی سمت میں تھا اور حضور صلعم

اکثر وہاں اس کا ٹھنڈا تازہ پانی پینے جایا کرتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی **لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون** راستبازی کو ہرگز نہ حاصل کرو گے یہاں تک کہ اس سے خرچ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو!" (۹۲:۳)

ابو طلحہؓ کا رسول اللہ صلعم کے پاس گئے اور کہنے لگے "اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل کی ہے (پھر ان کے لئے آیت پڑھی) میری سب سے اچھی ملکیت یہ باغ ہے۔ میں اب اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں! آپ اس کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ آپ کو دکھائے وہ کریں! اس کے دینے سے جو تقویٰ اور راستبازی مجھے میسر آئے گی میں وہ چاہتا ہوں۔"

حضور صلعم نے جواب دیا "کتنی خوبصورت جائداد ہے! کتنا پھل دار اور کتنی منافع بخش! میرے خیال میں تمہیں اسے اپنے رشتہ داروں کو دینا چاہئے"۔ ابو طلحہؓ نے حضور صلعم کی اطاعت کی اور یہ جائیداد رشتہ داروں میں تقسیم کر دی۔

مندرجہ بالا تحریر سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خاندان کا ادارہ محبت و الفت کے جذبات، اسلامی اخلاقیات اور تہذیب اور عملی طور پر ایک دوسرے کی مدد اور حمایت سے آراستہ ہے اور اس طرح ایک مضبوط، مستحکم، اور صحت مند خاندانی یونٹ (اکائی) مضبوط اور مستحکم گروہوں اور سوسائٹیوں کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

پس اسلام میں خاندانی حقوق و فرائض نہ صرف سماجی اور اخلاقی ذمہ داریاں ہیں بلکہ ہر شخص خدا کے سامنے اس بارے میں جواب دہ ہے۔ جیساکہ حضور صلعم کی مندرجہ ذیل حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

"تم سے ہر ایک حکمران ہے اور تم میں سے ہر کوئی اپنے ماتحت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ بادشاہ بھی ایک حکمران ہے اور اس سے اپنی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ہر شخص اپنے گھرانہ کا حکمران ہے اور اس سے اپنے زیر نگہداشت افراد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے خاوند۔ کے گھر پر حکمران ہے اور اس سے اپنے زیر نگہداشت افراد کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اور ایک نوکر بھی جہاں تک کہ مالک کی املاک کا تعلق ہے ایک حکمران ہے اور اس سے بھی اس امانت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (بخاری ۱۱:۱)

(بقیہ از صفحہ ۲۴)

مقابلے میں کم قابل اعتماد ہیں اور ان میں ذہنی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔

جہاں تک قابل اعتماد ہونے کا تعلق ہے، قرآن نے شہادت میں مردوں کے لئے بھی دو کی شرط عائد کی ہے کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ قرآن مردوں کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا اسی لئے ایک کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ایک کے ساتھ دوسرے کی شہادت بھی ضروری قرار دی؟ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصود یہ نہیں کہ ایک مرد قابل اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک بیان میں سہو یا سقم رہ جائے تو دوسرے کے بیان سے اس کی کمی پوری ہو جائے۔ یعنی اس سے ایک امکانی احتمال کی قانونی روک تھام مقصود ہے۔ مردوں کے متعلق یہ فتویٰ دینا مقصود نہیں کہ مرد قابل اعتماد نہیں اس لئے ان میں سے کسی ایک (تنہا) شہادت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے یعنی مقصود شہادت کی توثیق (پختہ کرنا) ہے نہ کہ مردوں کے ناقابل اعتماد ہونے کا اعلان۔

(ہفت روزہ "پردہ چاک" لاہور ۱۳ر اگست ۱۹۹۹ء)

از مولانا سید ابوالحسن ندوی

انیسویں صدی میں ہندوپاک میں اسلام پر انگریزی میں تصنیفات اور حضرت مولانا محمد علی صاحب کی خدمات کا اعتراف

"اسلامیات اور مغربی مستشرقین کے تحقیقی کاموں پر منصفانہ تبصرہ اور عالم اسلام میں مسلمان مصنفین کے علمی و تحقیقی کاموں کا وسیع جائزہ" سے اقتباس

ایک صدی کا حاصل

اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی انگریزی زبان کی طرف توجہ اور اس کی تعلیم سے دلچسپی اور اہتمام کی ابتداء ۱۸۷۵ء سے تسلیم کی جائے' جبکہ علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا گیا تھا اور ۱۹۸۱ء تک اس سلسلہ کو کھینچا جائے' تو صاف نظر آئے گا کہ اس مدت میں ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے ایسے کئی افراد پیدا کئے' جو اہل زبان کی طرح انگریزی لکھتے اور بولتے تھے' اس ایک صدی کی طویل مدت کے اعتبار سے انگریزی زبان میں ان کی تصنیفات' تعداد میں اگرچہ کم ہیں' لیکن اپنی علمی قدر و قیمت اور زبان کی خوبی کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہیں اور دوسرے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔

ہندوستانی مصنّفین کی چند ممتاز انگریزی تصنیفات

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہمیں انگریزی کے ایسے مسلمان مصنفین نظر آتے ہیں' جنھوں نے تاریخ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کے موضوع پر ایسی کتابیں تصنیف کیں' جن کی زبان کی حلاوت و قوت سے خود اہل زبان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے' اور جنھوں نے اپنے قیمتی مواد اور دلکش اسلوب بیان سے یورپ کے اہل نظر کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا' ان میں سرفہرست رائٹ آنریبل جسٹس سید امیر علی ہیں جنھوں نے The Spirit of Islam (روح اسلام) تصنیف کی اگرچہ ان کے افکار و خیالات سے کلیتہ" اتفاق مشکل ہے' تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اس کتاب نے برطانیہ کے علمی و ادبی حلقوں کو اعتراف و تحسین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریزوں کی ایک تعداد کو اسلام کی صداقت و حقانیت تسلیم کرنے پر مجبور کیا' مشترق (Osborn) اس کتاب کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"یہ کتاب یقیناً" داد و تحسین کی مستحق ہے' اس کا طرز بیان بتاتا ہے کہ مصنف کو انگریزی زبان پر بھرپور قدرت ہے' کم ایسے اہل زبان ہوں گے جو مصنف کے اسلوب کا مقابلہ کر سکیں' یہ اسلوب ان عیوب و نقائص سے پاک ہے' جن میں ہندوستان کے انگریزی تعلیمیافتہ عام طور پر مبتلا ہیں' مسلمانان ہند کو مبارک ہو کہ ان میں ایسے افراد بھی ہیں جو اس مقام پر فائز ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ جس کا نقش اول یہ کتاب ہو وہ مستقبل میں فعال کردار اور گہرے اثرات نہ چھوڑے۔ جہاں تک کتاب کے موضوع کا تعلق ہے' ہم بہت سے مسائل میں ان سے اختلاف رکھتے ہیں' اور اپنا نقطہ نظر اور وجہ اختلاف بعد میں ذکر کریں گے"۔

سید امیر علی کی دوسری کتاب A Short History of the Saracens (مختصر تاریخ عرب) بھی طویل زمانہ تک زبان کی سلاست و روانی' عمدہ طرز نگارش اور اعتدال و توازن کی بناء پر مقبول عام رہی۔

دوسرے مسلمان مصنف جن کی شہرت ہندوستان سے متجاوز ہو کر دوسرے ممالک تک پہونچی صلاح الدین خدا بخش ہیں' جنھوں نے

اسلامی موضوعات پر کئی اہم کتابوں کا جرمن سے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کی براہ راست انگریزی تصنیفات اور مجموعہ مقالات میں زیادہ مشہور (Contribution to the History of Islamic Civilization) (اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ پر ایک نظر) کی دوسری جلد اور (Essays: India Islamic) (ہندوستان اور اسلام' چند مضامین و مقالات) ہیں' اگرچہ ان کے بہت سے افکار و خیالات سے جن میں تجدد اور مغربی خیالات سے تاثر صاف طور پر نمایاں ہے' تعلیمات اسلام اور تاریخ اسلام سے براہ راست واقفیت رکھنے والے متفق نہیں ہو سکتے' لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے برطانیہ کے علمی حلقوں سے داد و تحسین حاصل کی۔

اس دور۔ یعنی انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے ان مسلمان مصنفین کی جنہوں نے اسلامیات پر انگریزی میں کتابیں لکھیں' یہ نمایاں کمزوری رہی ہے کہ وہ مغرب' مغربی فلسفہ' اور مغرب کے طبیعاتی علوم سے جو ابھی تک طفولیت کے مراحل سے آگے نہیں بڑھے تھے' بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں' ان کے ہاں غیبی حقائق' معجزات' ماوراء طبیعات' اشیاء کی دور از کار تاویلات' ایک طرف یہ سائنسی معلومات و انکشافات اور طبیعاتی اصول و ضوابط اور دوسری طرف ان سماوی حقائق کے درمیان تطبیق' اسلامی و مغربی تہذیب و تمدن کو ہم آہنگ کرنے کی مضطربانہ کوششیں پائی جاتی ہیں' مزید برآں اس طرح کی اکثر کتابیں معذرت آمیز (apologetic) اور مدافعانہ (defensive) اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔

ان دو مصنفین کے بعد انگریزی میں لکھنے والے قابل ذکر مصنفین میں جن کے علم و فضل' گہرے مطالعہ اور تفکر نے بیرونی علمی دنیا کو متوجہ کیا' اور بلند پایہ اہل قلم اور اہل فکر نے اپنی تصنیفات اور مضامین میں ان کے حوالہ دیئے' ڈاکٹر سر محمد اقبال اور ان کی فکر انگیز کتاب (Reconstruction of Religious Thought in Islam) (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ) جو ان کے مدراس کے لیکچروں کا مجموعہ ہے' خاص طور پر نمایاں ہے۔ (بعض عقائد اور دینی حقائق کی تفہیم و تشریح میں فلسفیانہ غلو کے باوجود جس سے اتفاق مشکل ہے)

دوسرے علامہ عبداللہ یوسف علی ہیں جن کے انگریزی ترجمہ قرآن کو صفائی زبان' ادبی چاشنی' طاقتور اسلوب اور مترنم انداز بیان کی وجہ سے یورپ و امریکہ میں مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن پاکستان' سعودی عرب اور دوسرے اسلامی ممالک سے شائع ہوئے ہیں' اسی طرح ایم۔ ایم پکتھال (M.M. Pickthall) کا انگریزی ترجمہ گو اس میں بعض اغلاط پائے جاتے ہیں کی زبان کی شیرینی اور اہل زبان کی سلاست و طلاقت کی بناء پر انگریزی بولنے والے ملکوں میں خاصی پذیرائی ہوئی۔

قرآن کے انگریزی تراجم کے اس تذکرہ میں بڑی ناسپاسی اور ناانصافی ہو گی' اگر ہم اردو کے مسلمہ ادیب مولانا عبدالماجد دریا بادی کے انگریزی ترجمہ قرآن کا تذکرہ نہ کریں۔ اس ترجمہ کی اہمیت و وقعت ان معلومات افزا حواشی اور نوٹس کی بناء پر ہے جو بائبل اور قرآن کے مشترک مقامات' شخصیات اور واقعات پر نئی تحقیقات اور مذاہب و عقائد کے گہرے تقابلی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ مولانا نے اس سلسلہ میں نئے علمی مواد اور مسیحی اور یہودی ماخذ سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اس مطالعہ اور تحقیق کا نچوڑ ان حواشی میں رکھ دیا ہے اور اس سے قرآن کے علوم و حقائق کو ثابت کرنے اور قرآن کے اعجاز کو واشگاف کرنے میں اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ یہ وہ پہلو ہے جس میں وہ اپنے تمام ہم عصر مترجمین قرآن سے فائق نظر آتے ہیں' افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک اس ترجمہ کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا۔

اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے تعارف کے سلسلہ میں احمدیوں کی ابتدائی مساعی

لاہور کی جماعت احمدیہ نے تعلیمیافتہ طبقہ کے لئے انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر تیار کرنے کے کام سے خاص دلچسپی لی۔ ان کے کام کو ہند و بیرون ہند کے تعلیمیافتہ طبقہ میں انگریزی زبان میں ہونے اور اچھے انداز میں پیش کئے جانے کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان مصنفین میں سرفہرست خود جماعت احمدیہ لاہور کے بانی و امیر مولوی محمد علی لاہوری ہیں جنہوں نے انگریزی زبان میں قرآن کا ترجمہ شائع کیا۔ جدید تعلیمیافتہ حضرات نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے قلم سے جو تشریحات و حواشی نکلے ان سے ایسے بہت سے افراد متاثر ہوئے' جن کا اسلام اور علوم اسلام کا مطالعہ براہ راست اور گہرا نہ تھا۔ اور جو جدید نظریات و تحقیقات اور سائنس کی ترقی سے مرعوب

تھے اور جن کو ایسی کتابوں اور اسلام کی ایسی تشریحات کی تلاش تھی، جو ان کی علمی ، مذہبی پیاس بجھا سکے۔ ان کے تفسیری نوٹس میں معجزات اور غیبی حقائق کو طبعی اشیاء اور عام قانون قدرت کے تابع بنانے کا رنگ، مبالغہ آمیزی و انتہاپسندی کی حد تک غالب ہے، خواہ ایسے موقعوں پر عربی زبان اور قرآنی الفاظ ساتھ نہ دے سکیں۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ طبعیات کا علم اور اس کی تحقیقات تغیر پذیر ہیں اور وہ ابھی طفولیت کے مرحلہ سے آگے نہیں بڑھی ہیں۔

مولوی محمد علی لاہوری کی ایک کتاب سیرت نبوی کے موضوع پر (Muhammad the Prophet) کے نام سے ہے جو ہند و بیرون ہند میں وسیع پیمانہ پر پڑھی گئی اور تعلیمیافتہ نوجوان اور یونیورسٹیوں کے ان اساتذہ نے اسے پسند کیا، جن کے سامنے سیرت پر انگریزی میں کوئی اور ایسی کتاب نہ تھی، جو نبوت محمدیؐ کی عظمت اور پیغام اسلام سے پردہ اٹھاتی، اور اس ماحول و حالات کی تصویر کشی کرتی جن میں نبوت کا ظہور ہوا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو اختصار و جامعیت کے ساتھ پیش کرتی اس صورت حال سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ صحیح اسلامی کتابوں کا وجود جن سے نوجوان اور تعلیمیافتہ افراد اسلام اور پیغامبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعارف ہو سکیں، از حد ضروری ہے کیونکہ اگر مکمل قابل اعتبار اور معیاری تصنیفات موجود نہیں ہیں، تو یہ طبقہ اپنی پیاس ان کتابوں سے بجھائے گا جو باسانی میسر ہو جاتی ہیں، اور جن میں صحیح الخیال طبقہ اور علمائے دین کو قابل اعتراض چیزیں نظر آتی ہیں۔

مولوی محمد علی لاہوری کے بعد ان کے رفیق و ہمعصر اور انگلینڈ میں مشہور و معروف مبلغ اسلام اور انگریزی کے زبان آور خطیب خواجہ کمال الدین نے اس میدان میں خصوصی شہرت حاصل کی۔ اس سلسلہ میں ان کی دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک The Ideal Prophet (مثالی نبی) دوسری Sources of Christianity (ینابیع المسیحیت) یہ بھی اپنے رفیق و امیر مولوی محمد علی لاہوری کی طرح مرزا غلام احمد صاحب کے معتقد و مرید تھے۔ لندن کا Woking mission سنٹر عرصہ تک ان کی زیر نگرانی اور سرپرستی میں کام کرتا رہا۔

معاصر مصنّفین

مغربی زبانوں کے مصنفین کی اس پہلی نسل سے ہم آگے بڑھیں تو معاصرین میں فاضل گرامی ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی مقیم حال پیرس، نمایاں اور ممتاز نظر آتے ہیں، جن کے علمی کاموں کی شہرت مشرق و مغرب میں پھیل چکی ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کا فرنچ میں ترجمہ کیا، جس نے فرانس کے علمی حلقوں میں قبول عام اور اعتماد حاصل کیا۔ ان کی تصنیفات میں سے دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک Introduction to Islam (اسلام کا تعارف) اور دوسری Muhammad Rasoolullah (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ان دونوں کتابوں کے ذریعہ ہزاروں انگریزی داں حضرات کو اسلام اور پیغامبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے واقف اور لذت آشنا ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، لیکن ان کی وہ کتاب جو ان کے فضل و کمال اور بحث و تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے، وہ صحیفہ ہمام بن منبہ ہے جس میں انہوں نے طاقتور اور واضح دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ جمع و تدوین حدیث کا کام عہد نبوی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ میں شروع ہو چکا تھا، اور وہ مسلسل بغیر کسی انقطاع کے مصنفین صحاح و سنن کے زمانہ تک جاری رہا۔ فاضل محقق نے اس کتاب میں نہ صرف علم حدیث کی، بلکہ اسلام کی عظیم خدمت انجام دی، جو تمام مسلمانوں کے شکرو اعتراف اور تحسین و آفرین کی مستحق ہے۔ ان کی دو اور کتابیں "عہد نبوی کا پہلا سیاسی دستور" اور "عہد نبوی کے میدان جنگ" بھی بحث و تحقیق کا اچھا نمونہ ہیں۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی خدمات سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیقات کو تاریخی دستاویزوں اور شہادتوں سے اور زیادہ مدلل اور محکم بنا دیا۔ Studies in early Hadith Literature (ابتدائی ذخائر حدیث کے مطالعے) لکھ کر اس علمی دعوی کو زیادہ تفصیل اور مدلل طور پر ثابت کر دیا کہ تدوین حدیث کا کام مسلسل طور پر جاری رہا، اور اس کی عمر سے کہیں زیادہ ہے جتنی کہ بتائی جاتی ہے۔

ہندوستان میں اسلامیات پر انگریزی میں لکھنے والوں کی فہرست طویل ہے، نمایاں لکھنے والوں میں مثال کے طور پر Islamic Outlines of Culture کے مصنف ایم۔ اے شوستری، اور The Mujaddid's Conception of Tauhid کے مصنف ڈاکٹر

برہان احمد فاروقی' نیز حافظ غلام سرور' ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدر آبادی (جنھوں نے انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا) سرامین جنگ' ڈاکٹر میرولی الدین' پروفیسر ظہیرالدین فاروقی' سید مظفرالدین ندوی' فضل کریم صاحب' سید اطہر حسین' سید محی الدین وغیرہ ہیں' لیکن یہ تصنیفی و تحقیقی کام اس زمانی رقبہ کے اعتبار سے کم ہے' جو پوری ایک صدی ۱۸۵۷-۱۹۸۱ پر محیط ہے۔

بعض نو مسلم مصنفین کی طاقتور اور موثر تصنیفات

یہ حقیقت بڑی تعجب خیز اور اسلام کی قوت تسخیر اور اس کی نئی نئی فتوحات کی دلیل ہے کہ ایک نو مسلم انگیزی زبان میں ایسی کتابیں لکھتا ہے' جو ایمان افروز' روح پرور اور خود مسلمانوں میں خود اعتمادی اور نیا ایمان پیدا کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میری مراد محمد اسد صاحب سے ہے' جن کا نام مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے Weiss Leopold تھا۔ جرمنی کے ایک یہودی خاندان سے ان کا تعلق ہے' ان کی کتاب Islam at the Crossroads (اسلام دوراہ پر) نے نہ صرف ایشیا بلکہ پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کے نئے تعلیمیافتہ اور صاحب فکر طبقہ میں اپنے دین و تہذیب کی طرف سے خود اعتمادی اور یقین کی روح پھونک دی۔ ایک طویل زمانہ سے عالم اسلام میں سنت نبویؐ اور اسلامی تہذیب و تمدن کا علمی و فکری طور پر اس طرح دفاع نہیں کیا گیا' اور اس کے مقدمہ کو (کم سے کم کسی مغربی زبان میں) اس طاقت سے پیش نہیں کیا گیا جیسا کہ اس کتاب میں۔ کسی یورپین مصنف نے ابھی تک اسلامی و مغربی تہذیب کے نقطہائے اتفاق و اختلاف کو اس تفصیل و وضاحت سے بیان نہیں کیا تھا' اور مغربی تہذیب کی ایسی جراتمندانہ تنقید نہیں کی تھی' جیسی کہ محمد اسد صاحب نے اس کتاب میں کی ہے۔ مصنف نے یہ کتاب ہندوستان کے دوران قیام میں تصنیف کی۔ بیروت کے فاضل ادیب و مورخ استاذ عمر فروخ نے الاسلام علی مفترق الطرق کے نام سے اس کا ترجمہ کیا جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

محمد اسد صاحب کی دوسری کتاب جس کو یورپ و امریکہ میں بڑے شوق و دلچسپی سے پڑھا گیا وہ Road to Mecca ہے' جس میں مصنف نے اسلامی تہذیب و تمدن کے محاسن و خصائص اور اسلام کی صداقت و عظمت کو بڑی مہارت اور سبک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے' اور اسلامی معاشرہ اور مسلمان ملکوں کی تہذیبی خصوصیات کی دلاویز طریق پر تصویر کشی کی ہے' جس کا تجربہ اور مشاہدہ اپنی ایک صحافتی مہم کے دوران ان کو ہوا۔ صحرائے عرب کے ایک پر خطر سفر میں پیش آنے والے ذاتی تجربات کے پردہ میں وہ بہت سی ایسی حقیقتیں بیان کر گئے ہیں' جو ایک کھلے ہوئے دعوتی اور تبلیغی پیرایہ میں بیان نہیں کی جا سکتیں۔ پھر یہ کتاب اعلیٰ ادبی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ "الطریق الی مکہ" کے نام سے ہوا' اردو ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" کے عنوان سے مولوی محمد الحسنی مرحوم مدیر البعث الاسلامی نے مولف کی اجازت سے کیا' اور "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنوٗ" سے شائع ہوا ہے۔

اسلامی موضوعات پر انگریزی زبان میں تصنیفات کے اس تذکرہ میں نو مسلم خاتون مریم جمیلہ کی نگارشات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا' جو ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیمیافتہ اور وسیع مطالعہ رکھنے والی امریکی خاتون ہیں۔ اسلام سے مشرف ہونے سے پہلے ان کا نام Marcus Margaret تھا' ان کے مضامین اور تصنیفات کی بنیاد مغربی تہذیب کے عمیق مطالعہ اور اس کے ذہنی اثرات سے نہ صرف مکمل آزادی بلکہ بیزاری اور بغاوت پر قائم ہے۔ ان کی دو کتابیں Islam Versus the West (اسلام یورپ کے مقابلہ پر) اور Islam and Modernism (اسلام اور تجدد پسندی) ان اہم کتابوں میں ہیں جن میں صاف طور پر سلامت فکر' عمیق مطالعہ اور اسلامی بصیرت جھلکتی ہے' مغربی تہذیب کی تنقید اور تجدد پسند تحریکوں پر تبصرہ کے سلسلہ میں ان کا قلم بڑا طاقتور اور بے لوچ ہے۔

دنیا کے مذہبی مفکرین میں باہم افہام و تفہیم کا رجحان

پریس رپورٹس کے مطابق ایک تنظیم نے مسلمانوں' عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان بین المذاہبی سرگرمیاں شروع کرنے کے متعلق تجاویز دی ہیں اور جن سرگرمیوں میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں۔

۱۔ تینوں مذاہب کیلئے مشترکہ عبادت گاہیں۔
۲۔ تینوں مذاہب کے آسمانی صحیفوں کو ایک ہی جلد میں شائع کرنا۔

مسلمان صاحب الرائے طبقوں کے بعض عناصر نے ان تجاویز کی سخت مخالفت کی ہے اور ان تجاویز پر دشمنان اسلام کی شیطانی ریشہ دوانیوں کا ٹھپہ لگایا ہے۔ سعودی عرب سے ایک فتویٰ حاصل کیا گیا ہے کہ "ان تجاویز کو صادر کرنا' ان پر یقین کرنا یا اس دعوت پر عمل کرنا کفر ہے"۔ اور مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ "کفر (یعنی تمام مذاہب کو یکجا کرنے کی تجاویز) کی طرف اس واضح دعوت کے خلاف احتیاطی تدابیر اختیار کریں اور ان کے دام سے بچنے کے متعلق حفاظتی تدابیر کی جائیں۔

ہمارے دوست اور قابل نامہ نگار (سونڈ ایم اکرم وہائٹ) نے سعودی عرب کا فتویٰ اور اس کے بارے میں تبصرے پڑھنے کے بعد ذیل کی گزارشات بھیجی ہیں :-

"ان بہت سی مشکلات اور رکاوٹوں کو دیکھتے ہوئے جو کہ اسلامی معلموں کو درپیش ہیں سنجیدہ علمائے دین کا ان معمولی اختلافی مسئلوں مثلاً" صحیفوں کا مجموعہ یا مشترکہ عبادت گاہیں (مثلاً" شاید ایسی جگہیں جہاں جگہ کی کمی ہو مگر آمدورفت زیادہ ہو جیسے ہوائی اڈے) پر اپنا وقت ضائع کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلامی سوچ کتنی سطحی ہو گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر آسمانی کتاب کو علیحدہ شائع کرنا اور ہر مذہبی گروپ کا اپنی مخصوص عبادت گاہوں کا ہونا قابل ترجیح ہے۔ مگر ایک شکی مزاج انسان ہی ہر اس بات سے جو غیر مانوس ہو وحشت کھا سکتا ہے اور ایسا شخص ہی یہ سوچ سکتا ہے کہ کوئی چیز جو پہلے کبھی نہ ہوئی ہو اسلام کے خلاف گردانی جائے۔

تاوقتیکہ متن میں کسی قسم کی تحریف نہ کی جائے' بائیبل اور قرآن کو ایک جلد میں شائع کرنے میں کیا حرج ہے؟ اس میں اسلام اور اس کے پیغام کیلئے کیا نقصان ہے؟

اگر کچھ ہے تو شاید یہ کہ بعض حالات میں یہ اس لحاظ سے سود مند ہو کہ کوئی غیر مسلم کی قرآن کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی ہو۔ کیونکہ دونوں کتابوں کو علیحدہ کی بجائے ایک جلد میں خریدنے سے خرچہ کم ہو جاتا ہے۔

(یہ تو قریباً" وہی بات ہوئی جو کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آسانی سے پڑھنے کیلئے بائبل دستیاب ہونے سے مسلمانوں کا ایمان کمزور ہو جائے گا!)

اگر میں ایک کمرہ کے مشرقی کونہ میں مغرب کی نماز پڑھوں کہ جس کے شمالی کونے میں صلیب اور آلٹر ہے تو کیا میری نماز باطل ہو جائے گی؟ کیا کسی جگہ اگر کسی غیر مسلم نے پہلے وقت میں نماز پڑھی ہو تو کیا اس جگہ شام کو میری نماز باطل ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہے تو اس اسلامی تعلیم کا کیا مطلب ہے کہ تمام روئے زمین ایک مسجد ہے"

ایک طرف جبکہ کثرت سے ایسے علماء ہیں جو مرتد کیلئے سزائے موت کا فتویٰ دیتے ہیں' عورتوں کے بنیادی حقوق کے خلاف ہیں اور تمام اسلامی اداروں اور مذہبی علوم کی درسگاہوں کو جمہوری ڈھانچہ میں ڈھالنے کی تمام کوششوں کے خلاف ہیں۔ تو ہمارے علماء کس طرح ان بظاہر بیکار اور غیر اہم مسائل پر اپنی توجہ مرکوز کر سکتے ہیں؟

برطانوی وزیر خارجہ اسلام کے متعلق فرماتے ہیں

ذیل میں ہم جناب رابن کک' برطانوی وزیر خارجہ کی اس تقریر میں سے کچھ اقتباس پیش کر رہے ہیں جو انہوں نے "اسلام اور مغرب" کے موضوع پر اسماعیلی سنٹر' لندن میں ۸ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو کی۔

"اب جبکہ ہم اسلامی دنیا سے اپنے تعلقات کو فروغ دے رہے ہیں ہمیں یعنی مغرب کیلئے سود مند ہو گا کہ ہم اس احسانمندی کو یاد رکھے جو ہماری تہذیب نے اسلام کو ادا کرنا ہے۔

"ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور جا چکے ہیں اس لئے کہ ہم نے اسلام اور مغرب کے درمیان غلط فہمی اور عدم اعتماد کو نشوونما پانے کا موقعہ فراہم کیا ہے۔ ہم اس غلط فہمی کے جاری رہنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ صرف اس لئے نہیں کہ یہ بات غلط ہے کہ دو

عظیم تہذیبیں افسوسناک طریقہ سے ایک دوسرے کے متعلق غلط فہمی کا شکار ہوں بلکہ اس لئے بھی کہ اس جدید دنیا میں ہمارے پاس مل جل کر رہنے اور کام کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ آج جو مسائل ہمیں درپیش ہیں وہ عالمی مسائل ہیں۔

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مغرب کو ایک دشمن کی ضرورت ہوتی ہے اور سرد جنگ ختم ہونے کے بعد اسلام پرانے سوویت یونین کی جگہ لے لے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ اب ان تہذیبوں کا ٹکراؤ ہو گا"۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ بات ہو کر رہے گی۔ میں کہتا ہوں کہ وہ غلطی پر ہیں۔ بڑی گہری غلطی پر ہیں۔ "اسلام بحیثیت ایک دشمن" کی ضرورت تو دور کی بات ہے۔ ہم اس کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے کہ اسلام ہمارے ایک دوست کے سوا کچھ اور ہو! چاہے ہماری تہذیبیں اور ہمارے مذہب مختلف ہی ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم باہم ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔

"سو ہمیں اس سلسلہ میں کوشش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ پیشگوئی پوری نہ ہو سکے۔ قرآن شریف فرماتا ہے "اے لوگو! ہم نے تمہیں نر اور مادہ کے ایک ہی جوڑا سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قومیں اور قبیلے بنایا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو" (۴۹:۱۳)' یہ نہیں کہتا کہ ایک دوسرے کو قابل نفرت سمجھو"۔

"اسی جذبہ سے ہمیں مل کر کام کرنا چاہئے تاکہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے میں آگے بڑھ سکیں اور ایک دوسرے کے متعلق جو غلط روایتی تصویر ہمارے دماغوں میں بنی ہوئی ہے اسے مٹا دیں اور باہمی عدم اعتماد کو دور کر دیں"۔

"ہم زیادہ تر ایک دوسرے کو روایتی تصور کے خطرناک آئینہ میں ہی دیکھتے ہیں۔ اسلام مغرب کو مادہ پرست' روحانیت سے خالی اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہے اور اس بات کا مصمم ارادہ کئے ہوئے سمجھتا ہے کہ وہ اپنی آزادانہ اقدار استعمال کر کے مسلمان معاشروں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ ادھر مغرب اسلام کو انتہا پسند پیروؤں کی سرگرمیوں کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ مغرب کا میڈیا زیادہ تر اسلام کو ایک بہت ہی بھرپور اور متنوع کلچر کے جو کہ دنیا کے ایک بڑے مذہب کی بنیاد پر قائم ہے۔ کی بجائے ان تمام بمباریوں اور بہیمانہ کارروائیوں کا مجموعہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ کارروائیاں جو صرف چند افراد سیاسی اغراض کے لئے کرتے ہیں اسے اسلام کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں نقطہ نظر بڑے گھمبیر طریقہ سے بے جا ہیں۔ یہ بات کہ یہ دو ایسی تہذیبیں ہیں جو باہم مل کر نہ رہ سکتی ہوں نہایت دور از کار ہے امر واقعہ یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں"۔

"مغرب اسلام کا بہت مرہون منت ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے مغربی تہذیب کے معتدبہ حصوں کے لئے عقلی بنیاد فراہم کی۔ ہندسوں سے لے کر ہمارے علم نجوم تک مغربی تہذیب کی بیشتر بنیاد اسلامی علم و فکر کی ترقی کی مرہون منت ہے۔

مغرب اگر کوئی بڑی غلطی کر سکتا ہے تو وہ یہ کہ وہ یہ سمجھے کہ اسلامی کلچر ایک بیگانہ کلچر ہے۔ یہ بیگانہ نہیں ہے! شروع تاریخ سے ہی ہمارے کلچر آپس میں گھلے ملے ہوئے ہیں۔ اور آج بھی ہیں۔

"جوں جوں ہمارے مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ باہمی آمیزش کا عمل پروان چڑھنا چاہئے۔

"اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس باہمی افہام و تفہیم اور اعتماد کو فروغ دینا شروع کریں۔ جس کی ہمیں فوری ضرورت ہے"۔

میں یورپ اور اسلامی دنیا کے درمیان بات چیت کے ذریعہ افہام و تفہیم کے لئے باقاعدہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں اب وقت آ گیا ہے کہ یورپین یونین اور او آئی سی (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) باہمی دلچسپی کے امور پر ایک اعلیٰ سطح پر بات چیت شروع کریں۔ بلقان' مشرق وسطیٰ میں امن' افغانستان' دہشت گردی' منشیات کی روک تھام' انسانی حقوق اور اقلیتوں کے ساتھ سلوک' ان سب پر باہمی بات چیت کرنے سے ہی ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں"۔

مگر یہ گفتگو اور افہام و تفہیم صرف سفارت کاروں یا وزرائے خارجہ کے درمیان ہی نہ ہونی چاہئے۔ گو خود میرے عہدہ کا نام بڑا عالیشان ہے اور عہدہ کی ذمہ داریاں بھی عظیم ہے۔ مگر میں کبھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ دراصل یہ عام لوگ ہی ہیں جو ان معاملوں میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اور دراصل وہی تعلقات زیادہ مستحکم ہوتے ہیں جو کہ لوگوں کے درمیان استوار ہوں۔

"اس لئے یورپ اور اسلامی دنیا میں جس گفتگو اور افہام و تفہیم کی بنا ہمیں رکھنی ہے وہ ہمارے عوام کے درمیان بھی ہونی چاہئے۔ ہمارے استادوں کو باہم گفتگو کرنی چاہئے۔ ہمارے فن کاروں' معماروں اور فلاسفروں کو بھی آپس میں تبادلہ خیالات کرنے چاہئے اور

یہ عمل فوری طور پر شروع کرنا چاہئے اس لئے کہ ایسا کرنے سے ہمیں بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے!

"اس سلسلہ میں آگے ہی بہت کچھ ہو رہا ہے۔ برطانیہ میں کئی ایک منفرد اور ممتاز علمی ادارے اس میدان میں بڑا اعلیٰ کام کر رہے ہیں۔ کئی ایک پرائیویٹ گروہ بھی اس عدم توازن کو دور کرنے میں مصروف ہیں۔ مگر ہم کوئی قابل ذکر پیش قدمی جو ہمیں چاہئے نہ کر پائیں گے جب تک کہ دونوں طرف کے اہل الرائے لوگ جن کا تعلق میڈیا، تعلیم اور دیگر شعبوں سے ہو اور وہ ان قدامت پرست اور بھٹکے ہوئے رویوں کو توڑنے کی کوشش نہ کریں جو دونوں تہذیبوں کے مابین تنازعہ اور مخاصمت کی بنیاد ہیں۔"

اخبار کا تراشہ

وراثت میں لڑکی کے حصہ کے متعلق ایک خیال انگیز تشریح

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے قرآن کریم میں ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ ۲ لڑکیوں کے برابر ہے۔ (ملاحظہ ہو ۴/۱۱) قرآن کریم کی رو سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جس میں اکتساب رزق کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے ذمے ہوتی ہے کیونکہ ان فرائض و واجبات کی ادائیگی سے جو بنیادی طور پر عورت کے ذمے ہوتے ہیں عورت کو بالعموم اتنی فرصت نہیں مل سکتی کہ وہ اکتساب رزق کا بوجھ اٹھا سکے۔ اب ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں اکتساب معاش کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے سر پر ہو اس میں معاشی اسباب کی تقسیم میں مرد کا حصہ یقیناً زیادہ ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکہ میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رکھا گیا ہے۔ لڑکیوں کے ذمہ نہ اپنے اخراجات کی کفالت ہوتی ہے نہ اپنے خاندان کے رزق کی کفالت۔ اس کے برعکس، لڑکے نے اپنے لئے بھی اکتساب رزق کرنا ہوتا ہے اور اپنی بیوی بچوں کے لئے بھی۔ اس لئے اسے زیادہ حصہ ملنا چاہئے جہاں ایسی صورت نہیں وہاں عورت کا حصہ مرد کے برابر رکھا گیا ہے۔ مثلاً ماں باپ میں سے ہر ایک کا حصہ (۱/۶) یا کلالہ کی صورت میں بہن اور بھائی میں سے ہر ایک کا حصہ (۱/۶)۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ قرآن مجید نے کلیہ کے طور پر عورت کا حصہ مرد سے نصف رکھا ہے۔

لیکن اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مرد اپنے اس فریضہ کو نظرانداز کر رہے ہوں اور لڑکیوں کے متعلق اندیشہ ہو کہ وہ کسمپرسی کی حالت میں رہ جائیں گی تو قرآن نے متوفی کو پورا پورا حق دیا ہے کہ وہ اپنے ترکہ کی تقسیم اقتضائے حالات کے مطابق جس طرح جی چاہے (از روئے وصیت) کر جائے ان کے مقرر کئے ہوئے حصے اس صورت میں عمل میں آتے ہیں جب متوفی بلا وصیت کے وفات پا جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہوتی ہو۔ قرآن میں اس کی صراحت موجود ہے۔

عورت کی گواہی

دوسرا اعتراض ہے شہادت کے متعلق۔ سورۃ بقرہ میں آیت نمبر ۲۸۲ میں ہے کہ جب تم آپس میں قرضہ کا معاملہ کرو تو اسے ضبط تحریر میں لے آؤ اور اس پر دو مرد بطور گواہ بلا لیا کرو۔ اس سے آگے قرآن میں ہے کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو بطور گواہ بلا لیا کرو۔ دو عورتیں کیوں بلائی جائیں۔ اس کی علت قرآن نے یہ کہہ کر خود ہی بیان کر دی ہے کہ یہ اس لئے کہ عام طور پر اس آیت کے معنی کئے جاتے ہیں کہ دو عورتوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

ضلال کے بنیادی معنی ہیں بات کا مبہم یا غیر واضح سا ہو جانا۔ ذہن میں الجھاؤ سا پیدا ہو جانا۔

اس لفظ کی وضاحت کے بعد اب اصل آیت کی طرف آیئے اس آیت سے یہ سوال اٹھائے جاتے ہیں کہ

ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کو کیوں ضروری قرار دیا گیا۔ اور یہ بات خصوصیت سے عورتوں کے متعلق کیوں کہی گئی کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ الجھاؤ سا پیدا ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے؟ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن کے نزدیک عورتیں مردوں کے

(بقیہ صفحہ ۱۷ پر)